انگریز دوستی کی کہانی

انگریز دوستوں کی زبانی

علامہ عبد الحکیم خان اختر
شاہجہان پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

بزم انوارِ سُنیت
CA-17 الفلاح ہاؤسنگ سوسائٹی شاہ فیصل کالونی
PH#03332189346

یک نگاہ

نام رسالہ — انگریز دوستی کی کہانی

انگریز دوستوں کی زبانی

مصنف — حضرت علامہ عبدالحکیم خان اختر شاہجہان پوری

کمپوزنگ /ڈیزائنگ — رضا پرنٹرز **03332189346**

صفحات — 176

قیمت

ملنے کا پتہ

مکتبہ رضا

CA-17 الفلاح سوسائٹی شاہ فیصل کالونی

ph#03332189346

مکتبہ رضویہ آرام باغ

انگریز دوستی کی کہانی
انگریز دوستوں کی زبانی

بعض مبتدعین کے علماء ومورخین بغض معاویہ میں یا اپنے اکابر کی انگریز دوستی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے علمائے اہلسنت کے بارے میں عوام کو چھلنے اور جہلاء میں اپنا بھرم بنائے رکھنے کی غرض سے مفروضات کا سہارا لے کر لکھ مارتے ہیں کہ اگر فلاں عالم انگریزوں کا ایجنٹ نہیں تھا تو اس نے ہمارے فلاں فلاں بزرگ کی تکفیر کیوں کی؟ یا چونکہ فلاں عالم نے تحریکِ خلافت یا فلاں گاندھوی منصوبے کی حمایت نہیں کی تھی لہذا ثابت ہوا کہ وہ مولوی انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ ایسے انصاف دشمن اور اسلامی تعلیمات سے نا آشنا حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس طرح خلافِ دیانت لکھنا اور غلط تاثرات پھیلانا حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ آخر خدا کے ولیوں اور مقبول بندوں سے بغض وعداوت رکھ کر، اللہ تعالیٰ سے لڑائی مول لینے میں دارین کی کون سی بھلائی کا راز پنہاں ہے؟

ایسے حاسدین اور انصاف کا خون کرنے والے محققین کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت اور اصلیت کے میدان میں یہ اگر، مگر اور چونکہ چنانچہ کے سہارے بے معنی اور فضول ہوا کرتے ہیں کیا کسی پر اتنا بڑا الزام صرف مفروضات کی بنا پر عائد کیا جا سکتا ہے؟ کیا فرضی مغالطوں میں بھی عقلاء کے نزدیک کوئی وزن ہوا کرتا ہے؟ اگر مخالفین اہلسنت

اور مبتدعینِ زمانہ کے پاس علمائے اہلسنت کی انگریز دوستی کا ایک بھی ٹھوس اور یقینی ثبوت ہے تو بڑے شوق سے اسے پیش کریں۔ لیکن یہ مدِ نظر رہے کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ، اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ٥ اگر ایک ثبوت بھی نہ لاسکو اور ہم کہہ دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

(نعوذ باللہ من ذلک)

برٹش گورنمنٹ کے پروردہ علماء نے شریعتِ اسلامیہ کو غتر بود کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، قارئین گزشتہ باب میں ملاحظہ فرما چکے۔ ان حضرات کی انگریز دوستی کے اگرچہ سیکڑوں بیانات پیشِ نظر ہیں لیکن بخوفِ طوالت مَا قَلَّ وَکَفٰی کے تحت چند حوالے پیشِ خدمت ہیں۔ وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقِ.

سید احمد صاحب بریلوی

سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے معاملہ طے ہوا تو آپ نواب امیر خاں پنڈاری کے ہاں جا کر ملازم ہوگئے۔ وہاں ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۶ء تک تقریباً سات سال رہے۔ ان ایام میں نواب امیر خاں کی پوزیشن کیا تھی؟ اِس بارے میں غلام رسول مہر یوں لکھتے ہیں:

> غرض امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقتور تھا۔ ایک موقع پر اس کے پاس چالیس ہزار جانباز جمع ہوگئے تھے اور ایک سو پندرہ توپیں

تھیں۔ اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلب ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہو سکتے تھے، لیکن اُنھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکرائیں، اِس لئے کہ جانتے تھے، مَن چلا آدمی ہے، مقابلے پر ڈٹ جائے گا تو ممکن ہے دوسری ملکی قوتیں بھی جو بظاہر دب گئی تھیں، اُبھر آئیں اور ہمیں بستر بوریا سنبھل کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے۔ وہ امیر خاں سے ٹکراتے نہیں، لیکن جو عناصر اُس کے لیے کمک و یاوری کا سرچشمہ بن سکتے تھے انھیں ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ توڑتے رہے یہاں تک کہ اُس کی فوج میں بھی انگریزی ریشہ دوانیاں خاصی پھیل گئی۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، بار سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۹۱، ۹۲)

جب نواب امیر خاں انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا تو دلوں کو دلوں سے راہ ہوتی ہے، اُن دنوں سید صاحب کو بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح الہام ہو رہا تھا۔ کس بات کا الہام ہو رہا تھا؟ مہر صاحب بتاتے ہیں:

" خود سید صاحب کا بیان ہے کہ غیبی اشاروں کی بنا پر وہ نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے۔ وقائع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے تو ایک روز فرمایا: "قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جنابِ الٰہی سے الہام ہوا کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر

میں جا اور وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی، وہاں ہم کو تجھ سے کچھ
اور کام بھی لینے ہیں۔ یہ مژدہ غیبی سن کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔
چندروز میں آ کر ملازمت نواب صاحب ممدوح کی حاصل کی'۔

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، بار سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۸۷)

نیز منظورہ صفحہ ۲۳۴ کے حوالے سے موصوف یوں رقمطراز ہیں:

"ازز مانہ کہ حضرت امیر المومنین ــــــ بنا بر
الہامیکہ درباب اقامتِ جہاد می شد، راهگرائی لشکر
ظفر اثر ــــــ امیر الدولہ نواب امیر خاں بہادر
مرحوم شدند۔" جس زمانے میں حضرت امیر المومنین اقامتِ
جہاد کے متعلق غیبی اشاروں کی بنا پر امیر الدولہ نواب امیر خاں
مرحوم کے لشکر ظفر اثر کی جانب روانہ ہوئے۔"

(ایضاً: ص ۸۷)

شاید کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے
حکم سے سیّد صاحب نے نواب موصوف کی فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ کیا تھا،
کیونکہ وہ پیر و مرشد تھے۔ جناب غلام رسول مہر اس خیال کے حق میں نہیں ہیں۔ ان
کی تحقیق یہی کہ شاہ صاحب کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں چنانچہ لکھتے ہیں.

" جو کچھ اُوپر بیان ہوا ہے اُس سے صاف آشکارا ہے کہ سید
صاحب نے بطور خود یہ فیصلہ فرمایا، شاہ صاحب کے امر و حکم کو اس
اقدام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھیں رائے بریلی ہی میں غیبی اشارہ ہوا

کہ نواب کے پاس جاؤ، چنانچہ وہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہوئے
راجپوتانہ پہنچ گئے۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۹۳)

نواب کی فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یوں رقمطراز ہیں:

"جب سید صاحب نے سواروں میں نام لکھوایا ہے تو آپ امیر
خاں کے آگے پیش کیے گئے۔ وہ دیکھ کے بہت خوش ہوا اور اس
نے یہ کہا، اگر اپنی جان کھپا کے محنت کی اور اپنی جوانمردی کے جوہر
دکھائے تو میں آپ کو ایک ہزار فوج کا افسر بنادوں گا۔"

(مرزا حیرت دہلوی: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۵۹)

سید صاحب نے الہام کی ہدایات کے مطابق خوب اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تاکہ نواب کا اعتماد حاصل کرلیا جائے۔ ساتھ ہی نواب موصوف کی خیر خواہی کا پوری طرح دم بھرتے رہے۔ آخر کار منزلِ مقصود ہاتھ آ گئی۔ یعنی:

"جب پے در پے یہ باتیں سیّد احمد صاحب سے ظہور پذیر ہوئیں،
پھر تو امیر خاں نے اپنا مشیر مقرر کرلیا اور کوئی کام بغیر آپ کے
مشورہ نہ کرتا تھا۔ ساتھ ہی اِن کامیابیوں کے جو سیّد صاحب کو
حاصل ہوئیں، یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے اِس ترقی پر
بھی اپنے فرائض کے انجام دینے سے (جو الہام کے ذریعے تفویض
ہوئے تھے پہلوتہی نہ کی۔ " (ایضاً ص ۳۵۹)

سید صاحب نے نواب کے پاس کس قسم کے اکل حلال سے ولایتِ انبیاء کی منازل

طے کی تھیں۔اس حقیقت کے چہرے سے مرزا حیرت دہلوی نے یوں نقاب اُٹھا کر حقیقت کو واضح کیا ہوا ہے:

"امیر خاں کے لشکر کی کوئی باقاعدہ تنخواہ نہ تھی۔کسی ریاست پر چھاپہ مارا، اگر وہاں سے کچھ ہاتھ لگ گیا تو باہم تقسیم ہو گیا نہ ہاتھ لگا لشکر میں فاقہ کشی ہو رہی ہے، لٹیروں کی سی کیفیت تھی۔کبھی جے پور پر حملہ کر کے یہاں زلزلہ ڈال دیا اور کبھی جودھ پور پر جا دوڑا وہاں ایک ہلکم مچا دی۔۔۔۔امیر خاں کے سپاہیوں کی زندگی جس قدر خطرناک تھی اسی قدر چاق و چست اور شمشیر زنی میں بسر ہوتی تھی، جو سپاہیانہ قالب کی سچی روح ہے۔

(مرزا حیرت دہلوی: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء، ص ۳۵۸، ۳۵۹)

"سیّد احمد صاحب تقریباً سات برس تک امیر خاں کی ملازمت میں رہے۔اِس عرصہ میں آپ کو بارہا مختلف جنگوں میں جانے اور توپ و بندوق و تلوار سے کام لینے کا موقع پڑا ہوگا۔کہیں کسی کے ساتھ آپ نے حملہ کیا ہوگا تو کہیں سرکش گاؤں کو لوٹا کھسوٹا ہوگا۔غرض ساری ہی باتیں جن سے جنگ و غارت تعبیر ہوسکتی ہے عمل میں آئی ہوں گی۔" (ایضاً: ص ۳۶۲)

سیّد احمد صاحب کو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور اس کی فوج میں بھرتی ہونے کا الہام کیوں ہوا تھا اور کس کی طرف سے ہوا تھا؟ اِس سوال کا جواب موصوف کی کارگزاری میں ہی مل سکتا ہے کہ اُن کا مشن کیا تھا، اور کب انھوں نے اپنے فرضِ منصبی

کو پورا کر کے نواب کو خیر باد کہا۔ مولوی محمد جعفر اس سلسلے میں یوں لکھتے ہیں:

"ایک روز کا ذکر ہے کہ لشکرِ نواب امیر خاں مرحوم انگریزوں کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ دونوں طرف سے توپ اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ اُس وقت سیّد صاحب اپنے خیمے میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے اپنا گھوڑا تیار کروایا اور اس پر سوار ہو کر مثل ہوا کے دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں انگریزی فوج کا سپہ سالار مع اپنے مصاحبوں کے کھڑا تھا۔ پس وہاں سے اُس سپہ سالار کو ساتھ لے کر پھر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اپنے خیمے تک چلے آئے۔ یہاں آ کر تھوڑی سی بات چیت کے بعد سپہ سالار مذکورہ نے عہد کر لیا کہ میں اِسی دم اپنے لشکر کو مقابلہ نواب امیر خاں سے واپس لے جاؤں گا اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا، بلکہ جہاں تک ممکن ہو گا اپنی سرکار کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ نواب امیر خاں سے صلح کر لے۔ اس واقعہ کے بعد پھر سرکار انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ صلح کی بات چیت اور رسل و رسائل شروع ہو گئے اور لارڈ ہیسٹنگ صاحب بہادر وائسرائے ہند کے عہد میں ٹونک کا ملک نواب صاحب کو دے کر صلح کی گئی۔"

(محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۷)

یہ تھا سیّد احمد صاحب کا مشن کہ نواب امیر خاں کا اعتماد پورے طور پر حاصل کر کے

انگریزوں کے حق میں فضا ہموار کرتے اور نواب کی جڑیں کاٹتے رہے۔ عین مقابلہ کے وقت ظاہر ہوئے کہ انگریزی فوج میں بھی صحنِ خانہ کی طرح وندناتے پھر رہے تھے اور کسی نے روکنے ٹوکنے کی ضرورت تک نہ سمجھی۔ امیر خاں کی آنکھیں کھلیں لیکن اُس وقت جب چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ مجبوراً صلح پر آمادہ ہونا پڑا۔ تھانیسری صاحب آگے یُوں تصریح کرتے ہیں:

"ابھی صلح کی بات چیت طے نہیں ہوئی تھی کہ سید صاحب سات برس کے قیام کے بعد پھر لشکر نواب امیر خاں سے جُدا ہو کر دوبارہ ۱۸۱۶ء میں دہلی تشریف لے گئے۔۔۔۔ اپنے چلنے کے وقت آپ نے یہ پیشین گوئی کی تھی، جس کو نواب وزیر الدولہ مرحوم (ابن نواب امیر خاں) اپنی وصایا وزیری میں اِس طرح لکھتے ہیں کہ سید صاحبؒ نے مولوی نذر محمد صاحب سے کہ وہ بھی اس لشکر میں موجود تھے اپنے رخصت ہونے کے وقت فرمایا تھا کہ "اب جلد صلح ہو جائے گی اور فلاں فلاں شہر اور فلاں فلاں علاقہ سرکار انگریزی نواب صاحب کو دے دے گی اور ایک زمانہ دراز گزرنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ میں بھی ایک لشکر مجاہدین کا ساتھ لے کر نشانوں کے پھریرے اڑاتا ہوا نواب امیر خاں صاحب کے ملک سے گزروں گا۔" اس پیشن گوئی کے ذکر کرنے کے بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ "موافق اس پیشن گوئی کے جو جو

شہر اور ممالک آپ نے بتلائے تھے۔ ٹھیک وہی سرکار انگریزی نے
ہم کو دیئے اور صلح ہو گئی۔"

(محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۱،۲۷)

موصوف کا بیان چونکہ نواب وزیر الدولہ ابن نواب امیر خاں کی کتاب "وصایا وزیری" کے حوالے سے ماخوذ اور مدلل ہے لہٰذا قابل تقسیم ہونے میں کیا شک و شبہ رہا؟ مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ سیّد احمد صاحب جو پیشگوئیاں کر رہے تھے اور موصوف پر جو الہامات کی بارش ہو رہی تھی اس کا معدن و مصدر برٹش گورنمنٹ ہی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ حوالوں کی روشنی میں ہر منصف مزاج نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ مزید تسلی کے لیے مرزا حیرت دہلوی کی تصدیق بھی قابل غور ہے موصوف لکھتے ہیں:

"آخر کار ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحب کی کارگزاری
سے ہر ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ
کر لیا، جیسے جے پور سے ٹونک دلوایا اور بھوپال سے سرونج، اِسی
طرح مختلف پر گنے مختلف ریاستوں سے بڑی قیل و قال کے بعد
انگریزوں نے دِلوا کے بپھرے ہوئے شیر کو اِس حکمت سے پنجرہ
میں بند کر دیا۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۲۷)

اس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صورتِ حال بیان کی۔ مذکورہ حوالہ میں بعض جگہ چونکہ اجمال سے کام لیا گیا ہے لہٰذا ان باتوں کی تفصیل کے

لیے موصوف کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا:

"۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے، مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی اور آپ ہی کے ذریعہ سے جو شہر بعد ازاں دیئے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے، دینے طے پائے تھے۔ لارڈ ہیسٹنگ سر سیّد احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اُس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ (۱) امیر خاں، (۲) لارڈ ہیسٹنگ اور (۳) سید احمد صاحب۔۔۔ سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اُتارا تھا۔ آپ نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑنا اگر تمہارے لیئے برا نہیں ہے تو تمہاری اولاد کے لیے سمِ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ انگریزوں کی قوت دن بدن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں پے در پے تنزل کرتی جاتی ہیں۔ تمہارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا اور عظیم الشان لشکر انگلشیہ کے مقابلے میں کون میدانِ جنگ میں لا کے جمائے گا؟ یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آگئی تھیں اور اب وہ اِس بات پر رضامند تھا کہ گزارہ کے لیے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں باآرام بیٹھوں۔"

(حیرت دہلوی مرزا۔ حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۱)

سید صاحب کو جو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور وہاں اپنی کارگزاری دکھانے کا الہام ہوا تھا۔ موصوف نے اس پر عمل کرنے کی غرض سے لوٹ مار، قتل وقتال اور فساد و دہشت انگیزی وغیرہ کسی چیز کو بھی وہاں قابلِ نفرت نہ سمجھا اور نیز لوٹ مار اور جبر و استبداد سے حاصل کیے ہوئے مال کو اکلِ حلال کے درجے سے ذرا بھی گرا ہوا نہ گردانا کیونکہ ان دنوں سید صاحب ان کے معتقدوں اور سوانح نگاروں کے مقدر سے ولایتِ انبیاء کی منازل کو سبک رفتاری سے طے کر رہے تھے۔ جب سات سالہ محنت شاقہ اور سعیِ پیہم کے باعث سید صاحب منزل مقصود پر پہنچ گئے، نواب امیر خاں کو شیشہ میں اُتار لیا، اُس بپھرے ہوئے شیر کو انگریزوں کے پنجرے میں بند کروا دیا اور اس طرح اپنے ملہم (لارڈ ہیسٹنگ) کو اپنی اس بے نظیر کارگزاری سے خوب خوش کر لیا تو موصوف انتہائی احترام کے مستحق قرار پا گئے۔ چنانچہ خاندانِ سید صاحب کے چشم و چراغ، مولوی سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ:

> "قلعۂ الٰہ آباد میں جو مسلمان سپاہی مختلف خدمات پر متعین تھے اور تین سو کی تعداد میں تھے انھوں نے انگریز قلعہ دار کی اجازت سے حضرت (سید صاحب) کو قلعہ میں تشریف لانے کی زحمت دی۔ شہ نشین پر جو سلاطینِ سابق کی تخت گاہ تھی، آپ کو بٹھایا اور بڑے خلوص واعتقاد کے ساتھ بیعت کی۔"

(ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ۱۹۶)

چونکہ سید صاحب سکھوں سے لڑنے کی تیاریاں کرنے والے تھے۔ اس لیے بطور شکریہ انگریزوں نے بھی موصوف کے راستوں میں دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے

تھے۔ سید صاحب بھی انگریزوں کی اس عقیدت کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور حتی الامکان کسی عام انگریز کو بھی مایوس نہیں کرتے تھے مثلاً:

> "جہاں آباد سے آگے ایک مقام اوجھنی میں ہوا۔ وہاں کے زمیندار شیخ لعل محمد نے دعوت کی اور سیکڑوں آدمی مرید ہوئے۔ آگے بڑھے تو راستے میں ایک انگریز کی مسلمان بیوی نے دعوت کی غرض سے روکا۔ سید صاحب نے اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انگریز خود آیا اور عرض کی کہ اُس کی دعوت نہ مانیئے لیکن میری دعوت قبول کر لینے میں تو تکلف نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے انگریز کی دعوت قبول کر لی۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰)

انگریزوں کے اسی ہدیۂ تشکر کی کہانی جناب غلام رسول مہر کی زبانی مزید پیش خدمت ہے:

> "صبح کو ڈگڈگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہوگئی تو ملاحوں نے ایسی جگہ کشتیاں باندھیں، جہاں آس پاس کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین دور دور تک اس درجہ خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس اثناء میں کالی گھٹا اُٹھی، تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ افشانی شروع ہوگئی۔ سب نے سمجھ لیا کہ رات کھائے بغیر گزارنی ہوگی۔ اچانک دور مشعلیں نظر آئیں۔ سمجھا گیا کہ کچھ لوگ کشتیوں کی طرف آ رہے ہیں۔ پاس پہنچے تو معلوم ہوا

کہ نیل کہ انگریز تاجر نے اپنے مسلمان کارکنوں کے پاس خاطر
سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی ہیں اور خود گھوڑے پر ساتھ آیا ہے۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۱۸۹)

جب دعوتوں کا تذکرہ ہی شروع ہو گیا تو مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی بھی ایک عقیدت مندی کی اس سے بھی عظیم الشان دعوت کا بیان سن لیا جائے۔ چنانچہ موصوف یُوں وضاحت فرماتے ہیں:

" جب وہ مشعلیں کنارے کے نزدیک پہنچیں تو دیکھا کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار مختلف قسم کا بہت سا کھانا ساتھ لیے چلا آتا ہے۔ اُس نے کشتی کے نزدیک آ کر پوچھا: پادری صاحب کہاں ہیں؟ جب حضرت نے کشتی میں سے جواب دیا تو وہ گھوڑے سے اُتر کر اور اپنی ٹوپی سر سے اتار کر بہت ادب سے حضرت کے سامنے کشتی میں آیا۔ بعد سلام و مزاج پُرسی کے عرض کیا کہ تین روز سے میں نے حضور کی تشریف آوری کی خبر لانے کے لیے نوکر اس طرف متعین کر رکھے تھے، سو آج انھوں نے مجھ کو خبر دی، لہٰذا یہ ماحضر، حضور اور کل قافلے کے لیے تیار کر کے لایا ہوں، براہِ بندہ نوازی اِس کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً وہ کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کر دو۔ تقریباً دو گھڑی تک وہ انگریز حضور میں حاضر رہا، پھر

رخصت لے کر مع اپنے آدمیوں کے واپس چلا گیا۔"

(محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۳۱)

دعوتوں کے یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ سید احمد صاحب اس تیاری جنگ کے سلسلے میں جب تک ہندوستان میں رہے تو انگریز وقتاً فوقتاً اس قسم کی ناز برداری کرتے رہے اور جب اپنی جمیعت کو لے کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں خبر گیری کا بھی حکومت نے انتظام کیا ہوا تھا۔ اس قافلے کی مذکورہ ضیافت کے واقعے کو سید ابوالحسن علی ندوی نے اِن لفظوں میں بیان کیا ہے:

"اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ انگریز گھوڑے پر سوار چند پالکیوں میں کھانا رکھے کشتی کے قریب آیا اور پُوچھا کہ پادری صاحب کہاں ہیں؟ حضرت نے کشتی پر سے جواب دیا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ انگریز گھوڑے پر سے اُترا اور ٹوپی ہاتھ میں لیے کشتی پر پہنچا اور مزاج پرسی کے بعد کہا کہ تین روز سے میں نے اپنے ملازم یہاں کھڑے کر دیئے تھے کہ آپ کی اطلاع کریں۔ آج انھوں نے اطلاع کی کہ اغلب یہ ہے کہ حضرت قافلہ کے ساتھ تمہارے مکان کے سامنے پہنچیں ۔ یہ اطلاع پا کر غروب آفتاب تک میں کھانے کی تیاری میں مشغول رہا۔ تیار کروانے کے بعد لایا ہوں۔ سیّد صاحب نے حکم دیا کہ کھانا اپنے برتنوں میں منتقل کر لیا جائے۔ کھانا لے کر قافلے میں تقسیم کر دیا گیا اور انگریز

دو تین گھنٹہ ٹھہر کر چلا گیا۔"

(ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید، جلد اوّل ص ۱۹۰)

جب انفرادی دعوت سے کھانے کی بھری ہوئی چند پالکیوں اور پلاؤ زردے تک بات آگئی تو اب پورے قافلے کی اُن عظیم الشان دعوتوں کا تذکرہ بھی کیوں نہ کر ہی دیا جائے جن کی نظیر چشمِ فلک کہن نے اُس وقت سے پہلے یا اُس وقت سے لے کر اب تک، برصغیر پاک و ہند کی زمین پر نہ دیکھی ہوگی۔ ضیافت اور دعوت پر ہی کیا منحصر؟ معلوم یہی ہوتا ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور بظاہر تو منتظم فلاں ابن فلاں نظر آرہے تھے لیکن اندرونِ خانہ حکومت ہی سب کچھ کر رہی تھی۔ خوب کھلا پلا کر، ہر طرح آراستہ و پیراستہ کر کے، قربانی کے بکرے بنا کر، اپنے اقتدار کی بلائیں اتارنے کے لیے بالاکوٹ میں بھینٹ چڑھانے کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ یہ حضرات اِن ناز برداریوں میں ایسے مست ہوئے کہ جاموں میں پھولے نہ سمائے

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

سید صاحب کے اس قافلے کی الٰہ آباد میں کس طرح ضیافتیں ہوئیں، کس قدر سامان امداد کے طور پر دیا گیا، یہ موصوف کے نامور سوانح نگار جناب غلام رسول مہر کی زبانی پیشِ خدمت ہے:

"شیخ غلام علی نے ہر ایک سے کہہ دیا تھا کہ دورانِ قیام الٰہ آباد میں کوئی صاحب سید صاحب کو کھانے کی تکلیف نہ دیں۔ یہ احسان صرف میرے ذمے رہنے دیا جائے ہاں

اپنے مکان پر لے جا کر پان کھلائیں، عطر لگائیں، نذریں پیش کریں، کھانا نہ کھلائیں چنانچہ سید صاحب جب تک الٰہ آباد میں ٹھہرے رہے پورے قافلے کی مہمان داری شیخ غلام علی نے فرمائی اور کس شان واہتمام کے ساتھ؟ آج اس کی تفصیلات سن کر شاید اکثر لوگ سمجھیں گے کہ خیالی افسانہ بیان ہو رہا ہے حالانکہ شیخ صاحب نے تواضع اور مدارات کا جو نمونہ پیش کیا اس کی محض سرسری کیفیت ہم تک پہنچ سکی ہے۔

شیخ صاحب مہاراجہ اودت نرائن والی بنارس کے مختار تھے۔ انھوں نے سید صاحب کو ایک کوٹھی میں ٹھہرایا۔ باقی قافلے کے لیے مہاراجہ کی بارہ دری خالی کرائی۔ پورے قافلے کے لیے دونوں وقت کا کھانا قیام گاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور کیسا کھانا؟ ایک ایک وقت میں کئی کئی چیزیں تیار ہو کر آتیں مثلاً قورمہ، پلاؤ، زردہ، شیر مال، تازہ مٹھائی، خمیری روٹیاں۔ اُس وقت تک ساتھیوں کی تعداد ساڑھے سات سو ہو چکی تھی لیکن شیخ صاحب کے تکلف میں کوئی کمی نہ آئی۔ اندازہ کیا گیا کہ کم از کم ایک ہزار روپے روزانہ کھانے پر صرف ہوتے تھے اور یہ اُس زمانے کا خرچ ہے جب جنسیں بے حد

ارزاں تھیں۔

شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے۔ ایک مرتبہ بعد نماز ظہر، دوسری مرتبہ بعد نماز مغرب، دونوں مرتبہ بیش بہا نذریں ساتھ لاتے مثلاً نہایت قیمتی پارچے، عمدہ بندوقیں، پستول اور تلواریں، بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے۔ وقف کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ صاحب نے اِس طریق پر جو نذریں پیش کیں، وہ بحیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی۔۔۔۔۔۔

اسی دوران میں شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے نئے تیار کرا کے پیش کیے کہ سفر میں کام آئیں گے۔ قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک جوڑی نئے جوتے، مردوں کو دو دو پاجامے، دو دو انگرکھے، دو دو ٹوپیاں اور ایک ایک چادر۔ مستورات کو دو دو پاجامے، دو دو کرتے اور دو دو دوپٹے دیئے سب کو سرِ عام ایک ایک روپیہ دیا۔ سید صاحب کے اقرباء کی خدمت میں دس دس روپے فی کس پیش کیے۔ علماء کی خدمت میں ان کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق نذریں گزرائیں۔

سید صاحب کے لیے روزانہ پانچ سو روپے یا کسی وقت کم یا زیادہ لے کر آتے ۔ دونوں وقت کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے بھجواتے ۔ ایک روز سید صاحب کی دونوں بیبیوں کو اسی اسی روپے دیئے گئے ۔لطف یہ کہ جب نذریں پیش کرتے تو بڑے ہی انکسار سے تہی دستی کا اظہار فرماتے ۔ رخصت کے وقت سید صاحب کی خدمت میں جو سامان لائے وہ بیس پچیس کشتیوں میں لگا ہوا تھا۔ اُس میں مشروع، کمخواب، پشمینے ، نینو، ڈھاکے کی ململ، محمودی، بنارسی اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے اور کشمیری شال بھی۔ اِن کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے۔ دو نہایت خوبصورت مطلا اور مُذہّب قرآن مجید نذر کیے ۔ ایک مکہ معظمہ کے لیے اور دوسرا مدینہ منورہ کے لیے۔ تمام اہلِ قافلہ کے لیے نو نو دس دس ہاتھ لمبے جامہ ہائے احرام تھے، جن میں ایک سو بیس تھان صرف ہوئے ۔ دو سو چالیس تھان گاڑھے کے اِن کے علاوہ تھے، تاکہ متفرق ضروریات میں کام آئیں۔

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۰۔۱۹۲)

اس کے بعد قیام کلکتہ کے دوران منشی امین الدین نے اس قافلے کی جو خاطر و مدارات کی یا ان کے ذریعے کسی نے کروائی اس کا تذکرہ پہلے مولوی محمد جعفر تھانیسری کے

لفظوں میں ملاحظہ فرمالیا جائے، وہ لکھتے ہیں:

''اس وقت منشی امین الدین صاحب وکیل سرکار جو کلکتہ کے مسلم رؤسا میں تھے مع بہت سے عمائد ساکنان کلکتہ کی خدمت شریف میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کلکتہ میں قیام تک اس خاکسار کے غریب خانہ میں مقیم رہیں اور جو نان ونمک میسر ہو قبول فرمائیں حضرت نے ان کی درخواست کو قبول کرلیا اس کے تھوڑی دیر بعد اور بہت سے شریف ونجیب کلکتہ کے وہاں پہنچے اور حضرت کو اپنے اپنے مکانات کو لے جانا چاہا مگر چونکہ حضرت نے منشی امین الدین سے وعدہ کرلیا تھا، اس واسطے ان کی درخواست کو منظور نہ فرمایا۔ نماز مغرب کے بعد اول حضرت بہ سواری پالکی منشی امین الدین کے مکان کو تشریف لے گئے اور پھر منشی صاحب نے ہر قسم کی سواریاں بھیج کر آدھی رات تک سارے قافلے کو اپنے مکان میں پہنچا دیا۔

ایک عمدہ باغ میں قافلے کا ڈیرا کرایا گیا رات کو نہایت عمدہ اور پُر تکلف کھانا منشی صاحب کے یہاں سے آیا اور بافراغت سارے قافلے نے سیر ہو کر کھایا۔ صبح کو منشی صاحب نے سارے قافلے کے واسطے جوتے خرید کر ہر

ایک کو تقسیم کر دیے جس کے پاس کپڑا نہ رہا تھا اس کو کپڑا بنوا
دیا۔لیکن اس تاریخ سے سید صاحب کو اس مکان میں اتار کر
جو منشی امین الدین صاحب رخصت ہوئے پھر
آ کر انھوں نے کبھی مُنہ نہ دکھلایا، اگرچہ دونوں وقت ان
کے یہاں سے سارے قافلے کو کھانا آتا تھا اور ان کے آدمی
ہر وقت خدمت کے واسطے موجود رہتے تھے مگر وہ خود کبھی نہ
آئے۔اسی طرح تقریباً ایک ماہ گزر گیا"۔

(محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۸ء ص ۱۳۶)

برٹش گورنمنٹ کے اس سرکاری وکیل یعنی منشی امین الدین نے سید احمد صاحب اور ان کے قافلے کی جس طرح خاطر مدارت کی اس کا نقشہ جناب غلام رسول مہر نے اپنی مورخانہ شان کے ساتھ کیوں کھینچا ہے

"منشی صاحب نے دریا کے کنارے بہت بڑی دری
بچھوادی تھی اور ہر قسم کی سواریاں بکثرت منگالی تھیں
مثلاً پنیس، ڈولیاں ، بگھیاں، کرانچیاں ، ہوادار وغیرہ
بار برداری کے لیے چھکڑے موجود تھے۔مزدور بھی خاصی
تعداد میں جمع تھے پہلے مستورات کو پردہ کر کے اتارا گیا اور
قیام گاہ پر بھیج دیا پھر مرد سوار ہوئے سواریاں اتنی زیادہ تھیں
کہ بہت سی خالی واپس کرنی پڑیں۔منشی صاحب سید
صاحب کو پنیس میں سوار کرا کے پہلے اپنے مکان پر لے

گئے، پھر قیام گاہ پر پہنچایا، جہاں تمام کمرے فرش سے آراستہ
تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کے مطابق پلنگ بچھے ہوئے
تھے متعدد اکابر نے بھی اپنے اپنے ہاں ٹھرنے کی درخواست
کی، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ منشی امین الدین احمد کے
ساتھ اقرار ہو چکا ہے اس لیے معذور ہوں البتہ دعوت قبول
کرلوں گا،
تین روز تک منشی صاحب کے ہاں سے نہایت پُر تکلف
کھانے آتے رہے، مثلاً قورمہ، شیر مال، باقر خانیاں، ماہی
پلاؤ، بکرے کا پلاؤ، کئی قسم کے مربے اور اچار، کئی قسم کے
میٹھے، سیدؒ صاحب کے لئے جو کھانا آتا اس میں اور بھی کئی
قسمیں ہوتیں۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے
صرف ایک قسم کا کھانا آئے انواع واقسام کے کھانے کو اہل
قافلہ میں تقسیم کرنا بھی مشکل ہے اور ہم لوگ تکلفات کو اچھا
بھی نہیں سمجھتے۔ منشی صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا اچھا نہیں
ہوتا اس لیے تکلفات میں مزید اہتمام واضافہ کر دیا"۔

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۷)

موصوف نے منشی امین الدین صاحب کی فیاضی یا ان کے حاکموں کی ذرہ نوازی کو
مزید یوں بیان کیا ہے۔

"منشی صاحب نے پورا باغ سید صاحب کی نذر کر دیا تھا۔

اس میں نارنگی، چکوترے، سنگترے، کیلے، انجیر، انار، امرود، ناریل، آم وغیرہ کے درخت تھے انگور کی بیلیں بھی تھیں، اناس بھی تھے۔ سید صاحب کے رفیقوں کی تقوٰی شعاری کا یہ عالم تھا کہ خود پھل توڑنا ایک طرف، جو پھل درختوں سے خود بخود گر جاتے انھیں بھی کوئی نہ اُٹھاتا۔ ایسے تمام پھل سید صاحب کے پاس جمع ہو جاتے، آپ پورے قافلے میں تقسیم فرما دیتے۔ قافلے کے بعض افراد کے جوتے ٹوٹ گئے تھے " مخزن احمدی" سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی امین الدین احمد نے پہلے ہی دن ضرورت مندوں کو تین سو روپے کے جوتے اور ایک ہزار سے زیادہ کے کپڑے خرید دیے۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۸)

یہ منشی امین الدین کون تھے اور ان کا کاروبار کیا تھا؟ ان کا انگریزوں سے کوئی تعلق دور یا نزدیک کا تھا یا نہیں؟ اِن جملہ امور کی وضاحت سید احمد صاحب کے عاشق زار اور وہابی بیڑے کے مؤرّخ نامدار عالی جناب غلام رسول مہر نے یوں دادِ تحقیق دیتے ہوئے، فرمائی ہے:

''اِس مقام پر کلکتہ سے ایک تیز رفتار کشتی میں جسے پینس کہتے تھے ایک صاحب آئے اور سید صاحب سے ملے۔ نام پوچھا تو بتایا، امین الدین۔ یہ منشی امین الدین احمد تھے جو بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے اور کلکتہ کے ممتاز

امیروں میں گنے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں انھیں
وکالت کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے ہندوستانی
علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے
پاس پیش ہوتے تھے، سب منشی صاحب ہی کی وساطت سے
پیش ہوتے تھے۔ ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر نہ تھی، لیکن حقِ
وکالت کی رقم اتنی بن جاتی تھی کہ صاحب "مخزنِ احمدی"
کے بیان کے مطابق ہر مہینے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار
روپے کی تھیلیاں ہاتھی پر لد کر اِن کے گھر پہنچتی تھیں۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۵)

کیا یہ امر جائے غور ہے یا نہیں کہ سید احمد صاحب کی صحبت سے منشی امین الدین احمد ابھی فیضیاب بھی نہیں ہوئے بلکہ زیارت کا شرف تک نصیب نہیں ہوا۔ اِس کے باوجود سید صاحب جو ابھی کلکتہ پہنچے بھی نہیں کہ انھیں پینس میں لے جانے کے لیے منشی امین الدین کس طرح اور کیوں آئے؟ کیا انھیں الہام ہو گیا تھا کہ فلاں صاحب آ رہے ہیں انھیں اپنے پاس لے آؤ۔ بغیر کچھ دیکھے بھالے، انھیں سید صاحب سے عقیدت کس طرح ہو گئی؟ کیا یہ رازداری کے ساتھ "ایسٹ انڈیا کمپنی" کا کارنامہ تو نہ تھا؟ شاید پورے ہندوستان میں سید صاحب کی اتنی آؤ بھگت اور عقیدت کا اہتمام نہ ہوا ہو جیسا انگریزوں کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ میں ہوا، حالانکہ کلکتہ اُن دنوں انگریزوں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ آخر ان لوگوں کو انگریزوں کے علاوہ اِس ڈرامے کے پارٹ ادا کرنے پر اور کس نے مائل کیا تھا؟ قبل ازیں خود منشی امین الدین احمد بھی

ایسی عقیدت سے نا آشنا اور بقول غلام رسول مہر، ہدایت سے محروم تھے۔ موصوف نے وضاحت کی ہے:

"جن لوگوں نے سید صاحب کی وجہ سے ہدایت پائی ان میں
خود منشی امین الدین احمد کا ذکر بھی ضروری ہے۔"

(ایضاً، ص ۲۰۹)

اگر منشی امین الدین احمد نے سیّد صاحب سے ہدایت پائی تھی تو جب سید صاحب کے قدم بھی کلکتہ میں نہیں پہنچے تھے اور وہ ابھی راستے میں ہی تھے اُس وقت قبل از ہدایت یہی منشی امین الدین احمد کیوں سید صاحب کو لینے کے لیے پہنچ گئے تھے؟ کیا یہ اس قافلے کے لیے راز داری کے ساتھ خود برٹش گورنمنٹ کا انتظام نہیں تھا؟ انگریزوں کی اس بستی میں، انگریزوں کی حوصلہ افزائی کے سہارے اِتنی اونچی پرواز اُڑنے لگے کہ پیشگوئی کے مژدے دیتے رہے اور انگریزوں کے خفیہ انتظامات کو اپنی کرامت سمجھتے تھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"سید صاحب نے کلکتہ پہنچ کر مولانا عبدالحیٔ سے فرمایا تھا کہ
اگر چہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں لیکن خدا کے فضل سے
اُمید ہے (" کمپنی کی مہربانی سے " کہنا زیادہ موزوں ہوتا)
اس شہر میں بابِ ہدایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے
والے حیران رہ جائیں گے۔ یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری
ہوئی اور اِس کی تصدیق بعض انگریزوں کے بیانات سے
بھی ہوتی ہے کہ ۱۸۲۲ء میں سید صاحب کلکتہ آئے اور مسلم

آبادی بہت بڑی تعداد میں ان کی پیرو بن گئی۔ شاہ اسحاق نے بیان فرمایا کہ سید صاحب کلکتہ پہنچے تو بہت سے مسلمانوں نے آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھایا اور آپ کے ارشادات کی برکت سے اس سرزمین میں خاص دینی رونق پیدا ہوگئی۔

حاجی حمزہ علی خاں کہتے ہیں، آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ سید صاحب کو آرام کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ سب لوگ شیرینی لاتے اور زیادہ تر بتاشے ہوتے۔ لوگوں کے پاسِ خاطر سے سید صاحب کم از کم ایک دانہ ضرور چکھتے، اس طرح زبان مبارک پر آبلے پڑ گئے تھے۔ بیعت کا سلسلہ دو اڑھائی پہر دن چڑھے سے شروع ہو جاتا اور رات تک جاری رہتا۔ عورتیں بھی بکثرت آتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کمرہ بھر جاتا۔ بہت سے غیر مسلم سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ کلکتہ اصلاً انگریزی بستی تھی، وہاں کی زندگی انگریزی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ عورتیں بے پردہ ہوتیں، شراب بکثرت پی جاتی۔ سید صاحب کی وجہ سے مسلمانوں میں پردے کا رواج ہوا اور شراب کی دکانیں بے رونق ہوگئیں۔ "

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۹)

انگریزوں کی اس آبادی یعنی کلکتہ میں سید صاحب کو جتنی آمدنی ہوئی اس کے بارے میں مہر صاحب یوں لکھتے ہیں:

" کلکتے والوں کے تحائف وہدایا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوسکا اس کی سرسری کیفیت یہ ہے:

ا۔ منشی امین الدین احمد، پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے جوتے، چار گٹھڑی کپڑے، ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا، ململ وغیرہ، دوسری میں سوسی اور چھینٹ کے تھان، باقی گٹھڑیوں میں موٹا کپڑا، دو نہایت خوبصورت گھڑیاں۔ پانچ ہزار روپے اِس غرض سے (مزید) پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقاء کو مزاج کے مطابق کھانا نہ ملا ہو اور انھوں نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ پانچ سو احرام دیئے۔

۲۔ امام بخش سوداگر: تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سفید اور چھینٹ کے۔ دو شیشیاں عطر کی، جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا۔ ایک بنگلہ جسے سید صاحب نے بااصرار واپس کر دیا۔

۳۔ غلام حسین تاجر: چار جہاز پورے نذر کیے اور اُن کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ چونکہ انتظام ہو

چکا تھا۔ اس لیے سید صاحب نے یہ نذر بشکریہ واپس کردی۔ غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کردیا۔ یقین ہے بڑی رقم بھی دی ہوگی۔ اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ ایک کوٹھی نذر کی جو سید صاحب نے اسے واپس دے دی۔ مراجعت پر سید صاحب اسی کے ہاں ٹھہرے تھے۔

۴۔ شیخ رمضانی: سعدالدین ناخدا، منشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چار سو احرام پیش کیے اور عرض کیا کہ جو احرام پہلے پیش ہو چکے ہیں عمرہ کے لیے باندھے جائیں، ہمارے احرام حج کے لیے استعمال کیے جائیں۔

۵۔ جس پیرزادے نے بیرونی دروازے سے مکان کے اندر تک سید صاحب کے لیے پگڑیاں بچھائی تھیں، اس نے سو روپے پیش کیے اس درجے کی دوسری نذروں کا حساب پیش کرنا مشکل ہے۔

سید صاحب نے سوار ہونے سے پیشتر حکم دے دیا تھا کہ ساتھیوں میں سے جس کے پاس ایک جوڑا ہو، اُسے تین جوڑے نئے بنوا دیے جائیں باقی لوگوں کے لیے کم از کم دو دو نئے جوڑوں کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک سو کے لیے دو دو جوڑے سلوا دیے گئے۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۵)

سید صاحب نے اس دورۂ حج کے سلسلے میں کتنے ہی شہروں کا دورہ کیا، ان کے ساتھ تقریباً ساڑھے سات سو آدمی جمع ہو گئے تھے جنھیں حج کے لیے ساتھ لے جانا منظور ہو گیا تھا۔ خود تو وہ بیچارے خالی ہاتھ تھے لیکن اِس دورے میں کمپنی بہادر کی نظرِ عنایت سے مسلمان رئیسوں کا نام رکھ کر نوازشوں کی وہ بارش ہوئی کہ جس کا اندازہ بھی کرنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے الہ آباد اور کلکتہ کے دو رئیسوں یعنی شیخ غلام علی اور منشی امین الدین احمد کی امداد کا ذکر کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی آپ کے ساتھ یہی سلوک رہا۔ بھولے بھالے مسلمان تو اپنے پاس سے نذریں پیش کرتے کیونکہ حج کے لیے ایسا جلوس انھوں نے نہ کبھی دیکھا ہوگا اور نہ کانوں سے سنا ہوگا لیکن بڑے بڑے رئیسوں نے جو بعض مقامات پر امداد کی اس میں برٹش گورنمنٹ کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ جن وجوہات کی بنا پر ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں ان کا ذکر ہر واقعے کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ حاشا وکلا ہمیں کسی سے خواہ مخواہ کی عداوت نہیں اور نہ ہم کسی پر الزام تراشی ہی کرنا چاہتے ہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ حقیقت کو اس کے اصل رنگ میں پیش کیا جائے۔

سید صاحب جب اس قافلے سمیت حج سے فارغ ہو کر ہندوستان وارد ہوئے تو غلام رسول مہر صاحب کی تحقیق کے مطابق ۶ صفر ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو کلکتہ پہنچ گئے۔ مختلف شہروں میں آپ کو مدعو کیا گیا، کافی کافی عرصہ وہاں قیام رہا۔ باقی ماندہ قافلے کے ساتھ ضیافتیں ہوتی رہیں۔ تحفے تحائف اور نذرانے وصول کرتے ہوئے بریلی پہنچ گئے۔ یہ ۳۹-۱۲۳۸ھ / ۲۳-۱۸۲۲ء کی فتوحات کا ذکر ہے۔

اب قارئین کی توجہ سید احمد صاحب کی تحریکِ جہاد کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔
معتقدین کا مؤقف یہ ہے کہ سکھوں کے مظالم کی بنا پر سید صاحب نے ان سے جنگ
کرنے کی ٹھانی تھی۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں آپ نے گشت کی۔ آپ کے
رفقاء یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبدالحیؒ (المتوفی ۱۲۴۳ھ) کے جگہ جگہ
ترغیب جہاد پر وعظ ہوئے۔ کتنے ہی مسلمان جان اور مال سے آپ کے ساتھی بن
گئے۔ یہ ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء میں دورہ کیا گیا۔ جب سید صاحب پوری طرح لیس ہو
گئے، ساتھیوں کی بھیڑ لگ گئی تو عازم پنجاب ہوئے لیکن اس روانگی سے پہلے اور
دورے کے شروع سے ہی اس الہام کا سنا دینا ضروری خیال کیا جاتا تھا، جو برٹش
گورنمنٹ کی طرف سے دوسرا اہم الہام بار بار کیا جا رہا تھا۔ وہ الہام یہ تھا:

> "آپ کے سفرِ جہاد سے پہلے، بارہا آپ کو یہ الہام ربانی ہوا
> تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے تا
> دریائے ستلج (یعنی سکھوں کا علاقہ) مثل ہندوستان کے
> رشک افزائے چمن ہو جائے گا۔ چنانچہ ان متواتر وعدہ
> ہائے فتح سے آپ کا ہر مرید واقف تھا۔"

(محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۱۷۲)

سید صاحب کی نظر میں جتنے ہندوستان پر انگریزی تسلط تھا، وہ رشک افزائے چمن تھا
اور ستلج سے پشاور تک کے علاقے کو بھی، جو سکھوں کے قبضے میں تھا، آپ انگریزی
علمداری میں شامل کر کے، رشک افزائے چمن بنانے کی خاطر تن من دھن کی بازی
لگانے پر تل گئے تھے، کیونکہ دوسری طرف سے بار بار الہام ہو رہا تھا۔ موصوف نے

اس الہام اور متواتر وعدہ ہائے فتح کے نام سے خوب جمعیت اکٹھی کی۔ بے شمار امداد ہوئی خطّی کے ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۴۶ھ تک کے خطوط میں بھی آپ اس الہام اور ان وعدہ ہائے فتح کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ کاش! اُن کا ضمیر بیدار ہو جاتا اور قوم کو ایسے عجیب چکر میں پھنسا کر نہ جاتے، کیونکہ:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا، دارا و جم

سید احمد صاحب نے یار محمد خان حاکمِ یاغستان کو خط لکھتے ہوئے اپنے دوسرے الہام کا خود یوں اظہار فرمایا:

"فقیر دریں باب باشاراتِ غیبی مامور است و بہ بشاراتِ لاریبی مبشر، ہرگز ہرگز شعبہ وسوسۂ شیطانی وشائبہ ہوائے نفسانی بایں الہام رحمانی ممتزج نیست، بالجملہ فقیر امتثالِ حکم الٰہی از تو دل مقصود است و اعتماد بوعدہ الٰہیہ بکلی حاصل، واما ایں کہ بوعدہ الٰہیہ بچہ طریق ظاہر گرد پس بندۂ عبودیت شعار راچہ یارا کہ از مالک خود بہ پرسد کہ وعدۂ خود را بچہ طور ایفا خواہی کرد، کہ ایں

سوال خارج از قانون آداب عبودیت است، بالجملہ از گفتگو و چون و چرا بیزارم و ازماندۂ اطاعت محض ذلہ بردار۔"

فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بنا پر مامور ہے اور اُس مبشر کی اس بشارت میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہش کا شائبہ اس الہام رحمانی میں شامل نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ کہ فقیر کو حکمِ الٰہی کی تعمیل تہ دل سے منظور ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر کامل اعتماد ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ کس طرح ظہور پذیر ہوگا؟ اس بندے کو جس کا شعار بندگی ہے کیا طاقت ہے کہ وہ اپنے مالک سے یہ پوچھے کہ تو اپنا وعدہ کس طرح پورا کرے گا؟ ایسا سوال آداب اور قانونِ عبودیت کے خلاف ہے۔ غرض میں ایسی چنان وچنین کی باتوں سے بیزار ہوں اور محض اس کی بندگی کے دستر خوان کا ریزہ چین ہوں۔

(محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۹ء ص ۳۹، ۴۰)

فقیر محمد خاں کے نام خط لکھتے ہوئے سید احمد صاحب نے یہ مژدہ انھیں ان لفظوں میں سنایا تھا:

"اما بیان الہام، پس فقیر از پردۂ غیب به بشاراتِ ربانی باستیصالِ کفار دراز مویان (یعنی قوم سکھ) مامور است و از ممکن لاریب به بشاراتِ رحمانی بغلبۂ مجاہدین ابرار مبشر۔"

اب رہا الہام، وہ یہ ہے کہ اس فقیر کو پردۂ غیب سے کفار یعنی لانبے بال والے سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ رحمانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار مجاہدین کو ان پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا ہے۔

(محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۲)

(مکتوبات کی عبارتوں کا ترجمہ اسی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے جو سخاوت مرزا نے کیا تھا)

شاہِ بخارا کے نام سید احمد صاحب نے جو طویل خط لکھا اس کی دو عبارتیں متعلقہ الہام حسب ذیل ہیں۔

در مقدمۂ اقامتِ جہاد و ازالۂ کفر و فساد بطریق الہام ربانی و کلام روحانی به اشاراتِ غیبی د رباب امامت مشرف ساختند و به بشاراتِ لاریبی و رباب فتح و ظفر مبشر ــــ ہرگز شعبۂ وسوسۂ

شیطانی و شائبۂ ہوائے نفسانی بایں داعیہ
رحمانی و الہام ربانی مخلوط نہ گردید۔
وَاللہُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْل
قیام جہاد کے معاملے اور کفر وفساد کے رفع دفع کرنے کے
لیے الہام اور روحانی مکالمہ کے ذریعہ غیبی امامت سے اس
فقیر کو مشرف فرمایا۔ اور ہم کو فتح و نصرت کے متعلق ایسی
بشارتوں کا مخبر۔۔ مامور فرمایا ہے۔ ہرگز ہرگز کوئی شیطانی
وسوسہ اور نفسانی خواہشات کا کوئی شائبہ بھی اس للّٰہی دعوت
اور الہام ربانی میں داخل نہیں ہے۔
وَاللہُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَکِیْلُ
(محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۸۱،۸۰)

سید صاحب کے مذکورہ بالا بیانات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ سید صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا، بار بار الہام ہوا کہ پنجاب تمہارے ہاتھ پر فتح ہوگا۔

۲۔ سید صاحب کو بذریعہ الہام بتایا گیا کہ تمہیں سکھوں کے استیصال کے لیے پیدا کیا گیا۔

۳۔ پنجاب کی فتح ونصرت کا مژدہ سنانے پر سید صاحب کو من جانب اللہ مامور کیا گیا تھا۔

۴۔ موصوف کو نہ صرف بذریعہ الہام بلکہ روحانی مکالمے کے ذریعے درجۂ امامت پر

فائز کیا گیا تھا۔

۵۔ پنجاب کی فتح اور سکھوں کے استیصال کا جو سہرا بذریعہ الہام سید احمد صاحب کے سر پر باندھا گیا تھا۔ اس الہام کی صداقت میں موصوف کے نزدیک شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

۶۔ ان دونوں مژدوں کو بشارتِ رحمانی اور الہام ربانی کے ذریعے پہنچایا گیا تھا۔

۷۔ اس ربانی الہام اور رحمانی بشارت کا ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہوگا کیونکہ ان میں شیطانی وسوسہ یا نفسانی خواہشات کا شائبہ تھوڑا ہی تھا، جو ان کا خلاف واقع ہو جائے

۸۔ سید صاحب اپنے الہام کی صداقت پر خدا کو گواہ رکھتے تھے۔

۹۔ موصوف خدا سے یہ پوچھ تو سکتے تھے کہ پنجاب کیسے فتح ہوگا اور سکھوں کا استیصال کن طریقوں اور کتنی تیاری سے کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سوال ان کے نزدیک شعارِ بندگی اور قانونِ عبودیت کے خلاف تھا۔

۱۰۔ موصوف کو قیامِ جہاد اور رفعِ فساد پر بذریعہ الہام مامور کیا گیا تھا۔ تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ. اس موضوع پر ہمیں کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سید صاحب کے بیانات کی روشنی میں ان کے معتقدین سوچیں اور فیصلہ کریں کہ یہ الہام رحمانی تھا یا شیطانی؟ بشارت رحمانی تھی یا خواہش نفسانی؟ کیا سید صاحب نے واقعی الہام کے مطابق پنجاب کو فتح کر لیا تھا اور سکھوں کا استیصال کر دیا تھا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اس کے علاوہ چارۂ کار بھی کوئی نہیں، تو فیصلہ کرنے میں دشواری کیا باقی رہ گئی؟ خدا کرے کسی کی اندھی عقیدت راستے میں حائل نہ ہو جائے

ورنہ معاملہ تو صاف ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کرتے تو نہ سہی، کل خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ آخر دنیائے دنی کا یہ اندھیرا چھٹے گا، صبح قیامت نمودار ہوگی۔

اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ○ کیا صبح قیامت قریب نہیں ہے؟ کہو گے تو سہی:

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُن کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

اگر اب بھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو سید صاحب کا اس سے بھی کئی گنا الہامی مژدہ سماعت فرمائیے اور اس کی روشنی میں ہی فیصلہ کر کے خار کو خار اور گل کو گل کا مقام دے لینا۔ ہمارا کام بفضلہٖ تعالیٰ سمجھا دینا ہے، دلوں کا پھیرنا اور ہدایت دینا باری تعالیٰ شانہ کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ وہ الہامی بیان پیشِ خدمت ہے:

"سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بر وقتِ روانگیِ خراسان آپ اپنی ہمشیرہ والدۂ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ "اے میری بہن! میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سنت زندہ نہ ہو جائے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا مارا

گیا تو تم اس کے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب
نے مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے کہ اِن چیزوں کو میرے ہاتھ
پر پورا کر کے مارے گا۔"

(محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۲)

اچھا ہوتا کہ سید صاحب اتنی سی وضاحت اور فرما دیتے کہ ان کے رب یا ارباب نے یہ وعدہ اُن سے کہاں بیٹھ کر کیا تھا؟ بہر حال سید صاحب کے اس بیان کی روشنی میں کہ جب تک مذکورہ چاروں ملکوں کو میں پاک صاف نہ کردوں اس سے پہلے اگر کوئی حلفیہ بھی میری موت کی خبر دے تو وہ جھوٹا ہے۔ہم خیر اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ موصوف سے ہند کا شرک، ایران کا رفض، چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق آج تک نہیں مٹایا جاسکا، لہٰذا موصوف اپنے بیان کی روشنی میں کہیں جیتے جاگتے ہی پھر رہے ہوں گے۔ ان کے رب نے تو ان کاموں سے پہلے نہ اٹھانے کا وعدہ کر ہی لیا تھا، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ موصوف پہلے ان چاروں ملکوں میں مردہ سنتوں کو زندہ کرتے پھر رہے ہوں گے۔ ویسے اس کا فیصلہ تو سید صاحب کے معتقدین ہی کر سکتے ہیں کہ سید صاحب اب زندہ ہیں یا نہیں؟ اگر وہ آنجہانی ہو چکے تو اپنے اس بیان کی روشنی میں انھیں سچا سمجھا جائے گا یا جھوٹا؟ کوئی کچھ بھی فیصلہ کرے یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ہاں قارئین کی معلومات کے لیے اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ خود سید صاحب کے اولین سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وعدۂ فتحِ پنجاب کے الہام کا خلاف واقع ہوا۔موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

"وعدۂ فتح پنجاب کا آپ (سید صاحب) کو ایسا وثوق تھا کہ

آپ اس کو سراسر صادق اور ہونہار سمجھ کر بارہا فرماتے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اس الہام میں وسوسۂ شیطانی اور شائبۂ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ ہوگی۔ لیکن معاملۂ بالاکوٹ، خواہ شہادت ہو یا غیوبت بظاہر سراسر اس یقینی الہام کے خلاف ہوا۔"

(محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۹۱)

تھانیسری صاحب نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سید صاحب کے الہام کے خلاف ہوا، انصاف کے دامن کو جھٹک دیا کیونکہ آگے صاف کہنا پڑ جاتا کہ اگر الہام کے خلاف واقع ہوا تو وہ رحمانی نہیں بلکہ شیطانی الہام تھا جسے وسوسۂ شیطانی کہتے ہیں، اس صورت میں سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے الہاموں میں شرعی لحاظ سے فرق بتانا مشکل ہوجاتا، لہٰذا انھوں نے فیصلے کی اس شاہراہ کو چھوڑ کر یوں تاویل کی پگڈنڈی پر چلنا شروع کردیا:

" اس وقوعہ (معرکۂ بالاکوٹ) کے پندرہ برس کے بعد سلطنتِ پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لا مذہب قوم کے ہاتھ میں آگئی جس کو ہم مسلمان (وہابی صاحبان) اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کرسکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی جو ظہور میں آئی۔" (ایضاً ص ۲۹۱)

تھانیسری صاحب تو خیر اب اِس دنیا میں نہیں ہیں۔ایں جہانی مؤرخین ہی بتا دیں کہ سیّد صاحب کا مذکورہ الہام ربّانی تھا یا شیطانی؟ اگر وہ بھی اس فیصلے سے کترا کر تھانیسری صاحب والی تاویل کا دامن تھامتے ہیں تو ہم ان کی خدمت میں یہ مؤدبانہ التماس پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اے انصاف کا خون کرنے والو! اس تاویل کا مفاد یہی تو ہے کہ برٹش گورنمنٹ یا سید احمد صاحب، ایک ہی تصویر کے دو۲ رخ تھے "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ تھا۔سیّد صاحب فتح کر لیتے یا انگریزوں نے پنجاب فتح کر لیا۔انگریز خود سکھوں سے لڑتے یا سید صاحب کو بھڑا دیا، ایک ہی بات ہے۔ مانا کہ قالب دو تھے لیکن جان تو دونوں طرف ایک تھی۔ بظاہر دونوں کے راستے الگ الگ نظر آتے تھے لیکن منزلِ مقصود دونوں کی ایک تھی۔یعنی انگریزی عملداری کی حدود کو اور وسیع کرنا، جسے سید صاحب اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے، نیز اِس عملداری کے راستوں کی رکاوٹوں کو دُور کر کے اِسے مضبوط و مستحکم کرتے تھے۔یہی تھی ان کی منزلِ مقصود اور یہی ہے ان کے جہاد کی غرض و غایت۔لہٰذا:

ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

بہر حال سیّد صاحب اپنے جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے، جمیعت کو لے کر گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور شہر شہر پھرے، جہاد کے نام سے بھولے بھالے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملایا، کتنے ہی مسلمانوں نے جہاد کے نام سے دھوکا کھا کر ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی پیش کی۔انگریز اس تیاری پر مانع نہیں ہوئے اور مانع کیوں ہوتے جبکہ

یہ سارا منصوبہ ہی انگریزوں کا اپنا تھا۔ سکھوں سے نہ لڑنے کا انگریز معاہدہ کر چکے تھے، دریائے ستلج کو سرحد قرار دیا جا چکا تھا۔ لیکن انگریزوں نے جب قلب ہند کے اپنے طاقتور دشمن کو بڑی حکمتِ عملی سے پنجرے میں بند کر لیا تو اب سکھ جیسی جنگ آزما قوم کو زیر کرنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اِس مقصد کے لیے برٹش گورنمنٹ کو سیّد احمد صاحب سے موزوں اور کون مل سکتا تھا، جنھوں نے جعفر بنگال اور صادقِ دکن کی سنتِ ملعونہ کو تازہ کرنے کی غرض سے ایک مسلمان فرمانروا یعنی نواب امیر خاں مرحوم کو انگریزوں کے پنجرے میں پھنسا کر بے دست و پا کروا دیا تھا۔ سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو زیر کرنے کا کام بھی سیّد احمد صاحب کے ہی سپرد کیا گیا۔ اندرونِ خانہ انگریز ہر طرح امدادی تھے، فریقین میں مکمل اتحاد و اتفاق تھا، لیکن پردہ رکھنے کی غرض سے جہاد کرنے کی برٹش گورنمنٹ سے یوں اجازت حاصل کی جاتی ہے:

> " اُس وقت ہر شہر، قصبہ و گاؤں، برٹش انڈیا میں علانیہ سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ ہوتا تھا مگر براہِ دور اندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الٰہ آباد کے نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی سکھوں خلاف جہاد کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں ہیں۔"

(محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء: ص ۱۶۸)

اسی اجازت کے واقعے کو مرزا حیرت دہلوی نے ذرا اور کھل کر یوں بیان کیا ہے:

" سید احمد صاحب نے مولانا شہید (مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) کے مشورہ سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کی تیاری کرنے کو ہیں، سرکار کو تو اس میں کچھ اعتراض نہیں ہے؟ لیفٹیننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عملداری کے امن میں خلل نہ پڑے، ہمیں کچھ سروکار نہیں، نہ ہم ایسی تیاری کے مانع ہیں یہ تمام بیّن بیّن ثبوت صاف صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف سکّھوں ہی کے لیے مخصوص تھا، سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز ہرگز مخاصمت نہ تھی۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷۰)

اعلیٰ حکام نے اُس وقت اپنے ماتحت افسروں کو مطلع کر دیا تھا کہ سیّد صاحب اینڈ کمپنی سے ہرگز مزاحمت نہ کرنا، یہ ہمارے مخالف نہیں ہیں۔ اس امر کی واضح تصریح مرزا حیرت دہلوی کے واشگاف لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے:

" جب مہیب تحریک پھیلی تو ضلع کے حکام اِس سے چونکے ہوئے اور انھیں خوف معلوم ہوا، کہیں ہماری سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور موجودہ امن میں تو کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا۔ اِس نظر سے ضلع کے حکام نے حکام اعلیٰ کو لکھا۔ وہاں

سے صاف جواب آگیا۔ اِن سے ہرگز مزاحمت نہ کرو، ان مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے، یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت میں بات بھی یہی تھی۔ بھلا مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلش سے کیوں سروکار ہونے لگا تھا؟ جہاں وہ اپنے دین کے لدکان بخوبی ادا کرسکتے تھے اور کرتے تھے۔ انھیں تولبریشن (مذہبی آزادی) بخوبی حاصل تھی۔ وہ صرف دشمنِ دین وایماں سکھوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے اوران کا ارادہ صرف سکھوں ہی سے اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام لینا تھا، جن کے قابلِ رحم مظالم کا بیان ہم مولانا شہید کی سوانح عمری میں بیان کرچکے ہیں۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۹، ۳۷۰)

بات اصل میں یہ ہے کہ حکّامِ اعلیٰ سیّد احمد صاحب کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھے کیونکہ وہ بیچارے انگریزوں کی مخالفت کیا کرتے جبکہ ساری زندگی ہی صرف انگریزی مفادات کے حصول وتحفظ میں گزاردی تھی۔ جن حضرات کو موصوف کی برٹش نوازی بلکہ ایجنٹ ہونے کا پتہ نہیں تھا انھوں نے اِس تیاری اور چہل پہل کے وقت عظیم آباد اور کلکتہ میں حکام اعلی سے اس تیاری کی شکایت کی، نقص امن کا خطرہ سمجھایا ،لیکن حکّام کے سامنے چونکہ اصل حقیقت موجود تھی وہ شکایت پر کیسے کان دھرتے اور بے خبر ہمدردوں کو کیوں منہ لگاتے؟ مہر صاحب یوں رقمطراز ہیں:

"بعض شیعہ حضرات نے (قیامِ عظیم آباد کے دوران)

انگریز حاکم کے پاس شکایت کی کہ سیّد صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں اور ہم لوگ از رُوئے خیر خواہی یہ حقیقت آپ تک پہنچاتے ہیں لیکن حاکم نے اس شکایت کو فرقہ وارانہ رقابت کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۲)

"بعض حاسدوں نے (قیام کلکتہ کے دوران) انگریزوں کے پاس شکایت کی کہ سید احمد پہلے نواب امیر خاں کے لشکر میں نشان بردار تھا، نواب کمپنی سے مل گیا تو سید احمد نے پیری مریدی کا ڈول ڈالا اور اب انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ محض بے علم ہے۔ اِس شکایت پر کسی نے توجہ نہ کی۔"

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۱۱)

نواب امیر خاں کو انگریزوں کے پنجرے میں بند کروانا اور سکھوں سے لڑ کر پنجاب کو انگریزی مقبوضات میں شامل کرنے کی کوشش کرنا، یہ سید احمد صاحب کے وہ کارنامے ہیں جو بڑی رازداری سے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اپنے منہ سے آج تک کون سے غدار نے اعتراف کیا ہے کہ میں اپنے دین اور اپنی ملت کے فلاں بدخواہ کا آلۂ کار ہوں؟ اس طرح تو میر جعفر اور میر صادق وغیرہ نے بھی تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ وہ بھی اپنے ان سیاہ کارناموں پر پردہ ڈال کر نازاں تھے۔ غداروں کا اندازہ بعض حالات و قرائن سے ہی لگایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا بیان مل جائے کہ کسی ایجنٹ

نے دشمن سے اپنی دوستی کا دم بھرا ہو یا اس کی تعریف کی ہو، تو میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ قابلِ اعتماد ثبوت کسی کی ایجنٹی کا آج تک تحریری طور پر نہ مل سکا ہوگا۔ آیئے اب ہم سیّد احمد صاحب کے بارے میں اُن کی گھریلو تصانیف سے ایسے بیانات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ اتنی دور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہیں؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم اور دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو، یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک و مددگار ہو جائیں گے، کیونکہ سیکڑوں کوس سفر کر کے، سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا، یہ ایک ایسا امرِ محال ہے، جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔

سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انگریزوں اور سکھوں کا ملک لینا ہی ہمارا مقصد ہے، بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے

اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اور انگریزی سرکار گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرائض مذہبی اور عباداتِ لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے اور ترویجِ مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع ومزاحم نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اُس کو سزا دینے کو تیار ہیں۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیائے سنن سید المرسلین ہے، سو ہم بلا روک ٹوک اِس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصولِ مذہب کے خلاف بلا وجہ طرفین کا خون گرادیں۔"

(محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۱)

یہی تھانیسری صاحب اِس بارے میں سید احمد صاحب کے مکتوبات اور حالاتِ زندگی کو مدِ نظر رکھ کر سب کی روشنی میں اپنے امیر المؤمنین کی انگریز دوستی کو واضح کرنے کی غرض سے یوں رقمطراز ہیں:

"اِس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیّد صاحبؒ کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز

ارادہ نہ تھا، وہ اِس آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے
تھے اور اِس میں شک نہیں کہ اگر انگریزی سرکار اُس وقت
سیّد صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب
کو کچھ مدد نہ پہنچتی مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے
چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو" (ایضاً: ص ۲۹۳)

دیوبندیوں کے نام نہاد مناظر مولوی محمد منظور نعمانی بھی سید صاحب کی انگریز دوستی کو غلط ثابت کرنے سے عاجز ہو کر ان کی اصلی پوزیشن کو تسلیم کرتے ہیں مگر کس طرح پہلو بدل کر، چنانچہ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

" مشہور یہ ہے کہ آپ (سید صاحب اینڈ کمپنی) نے
انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ
میں ان کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ
انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔"

(ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ، شہید نمبر، ۱۳۵۵ھ، ص ۷۶)

چونکہ مولوی محمد منظور دیوبندی نے اس بات کا اعتراف کرلیا ہے کہ انگریزوں نے بعض مواقع پر سید احمد صاحب کی امداد بھی کی تھی، لہٰذا ہم اِس امداد کے واقعات کو مدلل طور پر تھوڑی سی وضاحت سے پیش کرنا چاہتے۔ جب سیّد احمد صاحب لڑائیوں میں مصروف تھے۔ معتقدین کی نظر میں جہاد کر رہے تھے اور حقیقت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ تو انگریزوں نے موصوف کے لیے باقاعدہ وہاں بھی امداد بھیجنا جاری رکھا۔ دہلی اور دُوسرے مراکز کی معرفت بھیجتے رہے اور بعض

نوابوں کو بھی ترغیب دی۔ مثلاً:

"نواب ٹونک نے بھی دس بیس ہزار روپے شاہ اسحاق کی معرفت بھیجے۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷۷)

مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) کی معرفت بھی رقم جایا کرتی تھی اور حکومت اُس کی نگران و محافظ تھی۔ مثال کے طور پر ایک وقعہ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

"اِس (لیفٹیننٹ گورنر سے اجازت) کے بعد سید صاحبؒ ملک یاغستان میں پہنچ کر سکھوں سے جہاد میں مصروف تھے۔ اُس وقت ایک ہنڈی سات ہزار روپے کی بذریعہ ساہوکارانِ دہلی مرسلہ مولوی محمد اسحاق صاحبؒ بنام سید صاحبؒ روانہ ہوئی تھی۔ ملک پنجاب میں وصول نہ ہونے پر اس سات ہزار روپے کی واپسی کا دعویٰ عدالت دیوانی میں دائر ہو کر ڈگری ہوئی اور پھر ہنگام اپیل عدالتِ عالیہ دیوانی (ہائی کورٹ) آگرہ میں بھی حکم ڈگری بحق مدعی بحال رہا۔"

(محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۸)

مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے

"جب سید صاحب یاغستان میں تھے تو مولانا محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی نے کچھ اوپر سات ہزار روپیہ سید احمد

صاحب کو بذریعہ ہنڈی روانہ کیا تھا۔ وہ کسی باعث سے نہیں
پہنچا تھا۔ اس پر نالش کی گئی تھی اور پھر روپیہ وصول کر کے
دوبارہ سیّد صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۳۷۲)

قارئین کرام! یہ تھے سیّد احمد صاحب کے بارے میں ان کے سوانح نگاروں اور معتقدوں کے بیانات جن کے پیش نظر ہم نے ان سوانح نگاروں، سید صاحب کے اکثر معتقدوں اور دیگر غیر جانب دار مؤرخوں کے ساتھ ہمنوائی کی اور سید صاحب کو ان جملہ حضرات کی طرح برٹش نواز کہا اور لکھا۔ ہمارے علمائے اہلسنت موصوف کی اس روش پر گرفت بھی کرتے آئے ہیں۔ مبتدعین حضرات کے پاس کوئی دلیل حقیقت میں ایسی نہیں تھی جس سے وہ ذرا بھی صفائی پیش کر سکیں ۔دوسری مشکل انھیں یہ تھی کہ جملہ وہابی مؤرخ ہمارے دعویٰ کی اپنی اپنی تصانیف میں تائید کر گئے تھے اور انہوں نے سید صاحب کو خود فخریہ طور پر برٹش گورنمنٹ کا خیر خواہ بنایا ہے۔ان جملہ حالات کے برخلاف جناب غلام رسول مہر اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے اپنا مؤرخانہ زور صرف کیا اور بڑی شدومد سے سیّد صاحب کو انگریزوں کا دشمن منوانے کی کوششیں کرتے رہے ۔اور اپنے اکابر یعنی سید صاحب کے سابقہ سوانح نگاروں پر بھی الزام تراشی میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ مہر صاحب مولوی محمد جعفر تھانیسری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"اس کتاب (تواریخ عجیبہ) نے سید صاحب کے متعلق دو
نہایت افسوسناک غلط بیانیوں کو عام کیا۔ اوّل یہ کہ سیّد

صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے، صرف سکھوں
سے لڑائی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اِس غلط بیانی کو مستند بنانے
کے لیے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارتوں میں تحریف کی
گئی۔" (۔تواریخ عجیبہ مصنفہ محمد جعفر تھانیسری کے دوسرے ایڈیشن کا نام "سوانح احمدی"
رکھا گیا۔موجودہ ایڈیشن جو کراچی سے "نفیس اکیڈمی" والوں نے شائع کیا ہے اُنھوں نے پہلے
حصے کا نام "حیات سید احمد شہید" اور دوسرے کا نام "مکتوبات سید احمد شہید" رکھا ہے۔)

(غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹٦۸ء، ص ۲۷)

اس سلسلے میں دادِ تحقیق دیتے ہوئے موصوف اپنے دعوے کو یُوں موکّد کرتے ہیں:

"جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سر سیّد احمد
خاں مرحوم نے سیّد صاحب کے جہاد کا رُخ انگریزوں سے
ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب "ہمارے
ہندستانی مسلمان" چھپی تھی تو سر سید نے اس کی تہمت
طرازیوں کے جواب میں ایک سلسلۂ مضامین 'پایونیر" میں
چھپوا دیا تھا۔ جو بعد میں الگ بھی چھپ گیا تھا۔ اُن جوابی
مضامین میں یہ بھی کہا گیا کہ سیّد صاحب صرف سکھوں سے
لڑنا چاہتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ سے اظہار
برأت کر دیا تھا۔ سر سید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی نظر سے
گزرا ہو گا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے اُسے پھیلا کر
پیش کیا۔" (ایضاً: ص ۲۴۱)

یہی غلام رسول مہر اپنے موقف کو مضبوط کرنے کی غرض سے یوں انتہائی اقدام کر کے حقائق پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتے اور سیّد صاحب کو انگریزوں کا مخالف دکھانے کے لیے راستہ صاف کرتے ہیں:

> "سیّد صاحب کے متعلق قلمی ذخیروں تک چند افراد کے سِوا کسی کو دسترس حاصل نہ تھی۔ ' تواریخ عجیبہ " (سوانح احمدی) چھپی تو اُس میں سید صاحب کے مقاصدِ جہاد کا حلیہ بالکل بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ عام اصحاب نے اُسے مستند شے سمجھ کر قبول کرلیا۔ اِس طرح اُس پاک نفس مجاہد کبیر کے مقاصد ایک نہایت افسوسناک غلط فہمی کا ہدف بنے۔ میں مانتا ہوں کہ جس زمانے میں "تواریخ عجیبہ" لکھی گئی، سیّد صاحب کی تحریک انگریزوں کے عتاب کا مورد بنی ہوئی تھی۔ لیکن مولوی محمد جعفر تھانیسری صاحب مکاتیب کو چھوڑ سکتے تھے، انھیں تحریف شدہ شکل میں شائع کرنے کی کون سی مجبوری پیش آ گئی تھی؟ اور یہ حرکت ان لوگوں سے سرزد ہوئی جو سیّد صاحب کے عقیدت مند تھے۔'
>
> (غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۰)

جناب غلام رسول مہر کی اس بارے میں " ہاں میں ہاں ملانے" کا شرف اگر کسی صاحب کو علمی انداز میں آج کل حاصل ہے تو وہ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔اے ہیں۔ مورخانہ انداز میں موصوف نے اس میدان میں کافی کام کیا ہے۔ سیّد احمد

صاحب اینڈ کمپنی کی حمایت اور اُن کے مخالفین کو غلط ثابت کرنے میں آپ نے اپنی صلاحیتیں وقف کی ہوئی ہیں۔ اپنے محبوب ہیرو، جناب سید احمد صاحب کی تحریکِ جہاد کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> " واقعہ یہ ہے کہ یہ شوشہ بھی خود اپنوں ہی کی طرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کی غرض سے چھوڑا گیا۔ سب سے پہلے سر سیّد احمد خاں (ف۔۱۸۹۸ء) نے "اَوَرْ اِنڈین مسلمانس" پر تبصرہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جہاد سکھوں کے خلاف تھا۔ پھر اس تحریک کے خاص رُکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اصل مواد میں ترمیم کر کے انگریزوں کی بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور اس کو مشتہر کیا۔ بعض کوتاہ فہم یا پست ذہنیت رکھنے والے اشخاص تحریکِ مجاہدین کی اہمیت کم کرنے کے لیے اس قسم کے غیر معیاری رسالے کبھی کبھی چھاپتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کوچے ہی سے نابلد ہیں، وہ تحریکِ مجاہدین کو کیا سمجھیں؟"

(محمد ایوب قادری، پروفیسر: مقدمہ حیات سید احمد، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۹)

پروفیسر صاحب موصوف نے بھی جناب غلام رسول مہر کی تقلید میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کو موردِ الزام ٹھہرانے اور اُسی تحریکِ جہاد کے راز دار و سرگرم کارکن کو بدنام کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کی۔ اِن کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس

خانوادے کا کوئی بڑے سے بڑا، خواہ دین و دیانت سے کورا ماننا پڑے تو مان لیں گے لیکن سید احمد صاحب کی بگڑی کو بنانے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہ کریں گے۔ چنانچہ موصوف مزید لکھتے ہیں:

"اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ مولّف (محمد جعفر تھانیسری) نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاد کی تحریک از اول تا آخر سکھوں کے خلاف تھی۔ انگریزوں سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا اور سید احمد شہید کی جماعتِ مجاہدین کے سرگرم کارکن انگریزوں سے کوئی دشمنی یا پرخاش نہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر تھانیسری جماعت کے خاص راز دار تھے۔ جس کے نتیجہ میں اُنھوں نے خوفناک تکلیفیں اُٹھائیں، گھر بار لٹایا، ہزاروں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سے محروم ہوئے، بیوی بچے چھوٹے، عزتِ و دولت سے محروم ہوئے، زندگی کے بہترین اٹھارہ سال جنگلوں اور پہاڑوں (جزائر انڈمان) میں قیدی کی حیثیت سے گزارے۔ جب کالے پانی سے رِہا ہو کر آئے تو پولیس کی پابندیوں اور نگرانیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ اِن حالات و مصائب و آلام کا یہ ردِعمل ہوا کہ اُنھوں نے اِس موقع میں مصلحت کے قلم سے نقش و نگار

کرنے کی کوشش کی ہے، ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔"

(محمد ایوب قادری: تعارف مصنفِ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۸ء۔ ص ۴۵)

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں موصوف نے اپنا تاریخی بھرم رکھنے کی غرض سے غلام رسول مہر صاحب کی "ہاں میں ہاں" ملانے کا فرض ہی ادا کیا ہے۔ چنانچہ اس امر کا ثبوت پیش کرنے کی غرض سے پروفیسر صاحب یوں رقمطراز ہیں:

"حیرت کی بات یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سید احمد شہیدؒ کے بعض مکاتیب کی عبارتیں تک بدل دی گئی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "سید احمد شہید" میں اس کا انکشاف کیا ہے۔ (ص ۱۶۲ تا ۱۸۹۔ لاہور ۱۹۵۲ء)۔"

(محمد ایوب قادری: تعارف مصنفِ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۸ء ص ۴۵)

سید احمد صاحب کو انگریزوں کا مخالف منوانے کی خاطر وہابیوں کے نامور مورّخ یعنی غلام رسول مہر اور ان کے اتباع میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا اپنی سوا سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی جرأت و جسارت کرنا، ہوسکتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین وملت کی کوئی اہم خدمت یا سعادتِ دارین کا ذریعہ ہو، لیکن انصاف پسند اہلِ علم حضرات کے نزدیک، اس طرح تحقیق کے پردے میں تحریفیں کرنا دیانت داری سے بعید ہی شمار ہوتا ہے، کیونکہ یہ ملت پر ظلم اور تاریخ سے مذاق ہے۔

جب مصنفِ "تواریخ عجیبہ" مولوی محمد جعفر تھانیسری کو سید احمد صاحب کی تحریک کا سرگرم کارکن اور رازدار مان لیا، نیز یہ تسلیم کرلیا کہ انھوں نے اعانتِ تحریک کی پاداش

میں کالے پانی کی سزا پائی، اٹھارہ سال جزیرہ انڈیمان میں مقید رہے، جائداد ضبط ہوئی اور خوفناک تکلیفیں اٹھائیں دریں حالات، سید صاحب کے ایسے صبر آزما پیروکار پر خود سید صاحب ہی کی تاریخ کو بدلنے اور ان کے مکتوبات میں تحریف کرنے کا الزام لگانا کیسی خوفناک جسارت ہے۔

جناب غلام رسول مہر تو ۱۹۷۱ء میں آنجہانی ہو چکے، حقیقت حال اُن کی نگاہوں کے سامنے آ گئی ہوگی۔ علاوہ بریں اُن کا معاملہ چونکہ خود ہی سپردِ خدا ہے، اِس لیے اُن کی طرف روئے سخن کرنا مناسب ہی نہیں۔ راقم الحروف بصد ادب، جناب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔اے اور پروفیسر فیروز الدین روحی سے مخاطب ہو کر مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کا طلبگار ہے:

ا۔ کیا نواب امیر خاں کے پاس جانے کے وقت (۱۸۱۰ء) سے معرکۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) تک سید صاحب نے اکیس سال کے اندر کوئی ایسا بیان بنفسِ نفیس دیا، جس میں صاف صریح طور پر فرمایا ہو کہ ہم انگریزوں سے بھی جہاد کریں گے؟ ایسا بیان مطبوعہ ہونا چاہیے۔

۲۔ اگر سید احمد صاحب کا کوئی ایسا بیان نہ ہو تو کم از کم اُن کے دستِ راست مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ہی کا کوئی ایسا مطبوعہ بیان آنجناب کے پیشِ نظر ہے؟

۳۔ یہ بھی نہ سہی، وہ کون کون سے مورّخ ہیں جنھوں نے سید احمد صاحب کے بعد یعنی ۱۸۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ایک سو سولہ سالہ عرصے میں یہ وضاحت کی ہو کہ سید صاحب کا ارادہ انگریزوں سے لڑنے کا تھا؟

۴۔آپ حضرات ماشاء اللہ تاریخ دان بلکہ اسکالر کہلاتے ہیں، ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء کے بعد سید صاحب کے بعض خلفاء جو انگریزوں سے لڑے تھے اُن واقعات کو اصل تحریک کے نظریات کا جزو قرار نہ دے لینا۔ ۱۸۴۵ء میں سکھ نہیں بلکہ انگریز پنجاب کے حکمران بن گئے تھے۔ اس وقت انگریزوں نے اپنے ان خانہ زادوں کی گوشمالی ضروری سمجھی ہوگی کیوں کہ اب سرحد میں ان کا وجو انگریزی مفادات کے خلاف ہو کر رہ گیا تھا۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں تو برٹش گورنمنٹ نے دِلی خواہش کے ساتھ سکھوں اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے اپنے ان جانثاروں کو بھیجا تھا۔ اب انگریزوں کا مقصد پورا ہو چکا تھا، لہٰذا جو سلوک جعفر و صادق کے ساتھ کیا تھا وہ بھلا ان کے ساتھ کیوں نہ کرتے؟

راقم الحروف نے یہاں جو کچھ لکھا ہے کہ سکھوں اور مسلمانوں کو کچلنے کے لیے انھیں بھیجا تھا، اس جملے میں مسلمانوں کا لفظ شاید آپ حضرات کے جذبۂ عقیدت کو ٹھیس پہنچاتا ہو اور اس وجہ سے طبعِ نازک پر گراں گزر رہا ہو تو گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہیں۔ ہاں مجبوراً ایسا لکھنا پڑا ہے کیونکہ سید احمد صاحب کے جملہ سوانح نگاروں نے اِن بانکے مجاہدوں کا سب سے بڑا کارنامہ جو رنگ برنگی تاویلوں کے سہارے فخریہ انداز میں پیش کیا ہے، وہ مسلم کشی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

۵۔ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں سے خوفناک اذیتیں اٹھانے کے بعد مولوی محمد جعفر تھانیسری سہم گئے ہوں، انھوں نے قلم پر احتیاط کے پہرے بٹھا لیے ہوں۔ ان حالات میں یہی ہوتا کہ وہ منہ سے کچھ نہ کہتے، ڈر کے مارے خاموش رہتے، قلم کو بھی

حرکت میں نہ لاتے اور باقی زندگی خاموشی میں گزار کر راہیِ ملکِ عدم ہو جاتے۔ لیکن موجودہ مورّخین حضرات جس مصلحت کا تھانیسری صاحب پر بھوت سوار کر رہے ہیں، انھوں نے اس کے برعکس اُسی تحریک کے بانی کی سوانح حیات لکھ ڈالی، جس کے سرگرم کارکن ہونے کی بناء پر وہ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ عتاب رہے تھے۔ ایسا کیوں کیا؟

۶۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سید احمد صاحب کی سوانح حیات لکھنے کے سلسلے میں انھیں انگریزوں سے کسی قسم کے خطرے یا نقصان کا اندیشہ نہیں تھا، اسی لیے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ اگر سید صاحب انگریزوں کے مخالف ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ تھانیسری صاحب ان کی سوانح حیات لکھنے کا خیال تک بھی نہ لاتے۔ بصورتِ دیگر اگر پھر بھی لکھنے پر آمادہ ہوتے تو سید صاحب کو ۱۲۹۵ھ میں انگریزوں کا مخالف لکھ دینے سے انھیں اندیشہ کس بات کا تھا، جبکہ ۱۲۴۶ھ میں وہ معاملہ ہی ختم ہوگیا تھا۔ دریں حالات مولوی محمد جعفر تھانیسری کو تحریکِ جہاد کا رُخ موڑنے اور مکتوبات میں تحریف کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟

۷۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو اگر خطرہ لاحق ہوسکتا تھا تو صرف اسی صورت میں کہ وہ خود کو انگریزوں کا دشمن لکھتے یا ظاہر کرتے۔ کسی پچاس سال پیشتر کی ہستی یا تحریک کو انگریز دشمن لکھنے سے مصنف پر کون سی دفعہ عائد ہوسکتی تھی؟ دریں حالات اپنے بزرگ سید صاحب کے اولین سوانح نگار کی قبر پر حُبِ علی میں نہیں بلکہ بغض معاویہ میں، دُعائے خیر کے پھولوں کے بجائے بہتانات کے کانٹوں کی چادر کس جرم کی

پاداش میں چڑھائی جارہی ہے؟

۸۔آپ حضرات کو یہ شکایت ہے کہ جہاد کا رُخ انگریزوں کی طرف نہ پھیر کر تھانیسری صاحب نے تحریک کا حلیہ بگاڑ دیا۔گویا "تواریخ عجیبہ" کی ایک یہ حرکت اور دوسرا مسئلۂ غیوبت آپ کو کھٹکتا ہے اور ان کے علاوہ باقی سب خیریت ہے۔حالانکہ اُسی "تواریخ عجیبہ" نے سید صاحب کے معجزات وکرامات کا ڈھیر اور الہامیوں کا اندھیر اپنے اندر اس طرح محفوظ کیا ہے کہ سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مراتب میں ماسوائے اس کے اور کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ انھیں اپنے لیے نبی کہنے اور کہلوانے کی قدرت نے مہلت ہی نہیں دی اور ان کے اس خلاء کو مرزا صاحب کے ذریعے پورا کیا گیا تھا۔موجودہ مورخین حضرات نے اس جانب سے کیوں منہ پھیرا ہوا ہے؟ آخر اس کی وضاحت بھی تو کرنی چاہیے تھی؟

۹۔سر سیّد احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری نے جس وقت علی الاعلان اس تحریک جہاد کو صرف سکھوں کے ساتھ مخصوص کرنا شروع کیا تھا تو سید احمد صاحب کے معتقدین جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے پڑے تھے، ان میں سے کتنے حضرات نے اس اِدّعا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی؟

۱۰۔صدائے احتجاج بلند کرنا یا اس دعوے کو افترٰی ٹھہرنا تو دور کی بات ہے، ہم تو یہی دیکھتے ہیں، کہ ان کے اکثر معتقدین نے سر سید احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری کے ان بیانات پر مُہرِ تصدیق ہی ثبت کی تھی۔یہ درست ہے یا نہیں؟

۱۱۔اگر ان دونوں حضرات نے تحریک کا حلیہ بگاڑا تھا تو ان اہل علم اور صورت حال

سے واقف حضرات نے اس بداندیشی کا سدِ باب کیوں نہ کیا جو اس تحریک سے خود منسلک تھے اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کی طرح اس کے سرگرم کارکن اور راز دار تھے؟

۱۲۔ سید صاحب کے اُن معتقدین کے ناموں کی فہرست پیش کرنے کے لیے ہم تیار ہیں جنہوں نے موصوف کا انگریز دشمن ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ کیا ایسے جملہ حضرات کو آپ سید صاحب کے بدخواہ اور تحریف پسند لکھنے اور ماننے کے لیے تیار ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

۱۳۔ اگر بقول مہر صاحب، مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سیّد صاحب کے مکتوبات تک میں تحریف کر دی تھی تو ۱۹۴۷ء سے پہلے وہابیوں کے علماء اور مورخ کہاں سوئے پڑے تھے؟ انھوں نے اصل اور نقل کے فرق کو واضح کر کے، اس تحریف کے سلسلے میں اپنا فرض کیوں ادا نہیں کیا تھا؟

۱۴۔ نہ سہی، جن حضرات کے قبضے میں وہ مکتوبات تھے کم از کم اُنھیں تو اپنے وحی و عصمت والے اور خدا سے مصافحہ و ملاقات کرنے والے، بلکہ باری تعالیٰ شانہ سے ہمکلامی کے شرف سے مشرف ہونے والے دادا پیر کی حمایت میں اغماض سے کام لے کر، بدخواہوں کی فہرست میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہیے تھا، آخر وہ سب کے سب کیوں چپ سادھے پڑے رہے؟

۱۵۔ غلام رسول مہر کی تازہ تحقیق پر تو جناب قادری صاحب ایمان لے آئے کہ مکتوبات کی اصل عبارتیں یوں نہیں بلکہ یوں ہیں۔ لیکن موصوف نے اس طائفہ کی تاریخ کو شاید وہابیت کی عینک اتار کر دیکھنے کا شرف کبھی حاصل ہی نہیں کیا ورنہ انھیں

صاف نظر آجاتا کہ اِس جماعت کے اُونچی چوٹی کے علماء بھی اتنے جری اور بیباک ہیں کہ خود باری تعالیٰ شانہ اوراس کے سب سے برگزیدہ رسول پر بہتانات باندھتے ہوئے بھی کبھی نہیں ڈرے، عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفوی کی ناپ تول کرتے رہنا ان حضرات کا دائمی مشغلہ ہے، قرآن کریم کی کتنی ہی آیات کے چودہ سو سالہ متوارث معانی ومطالب سے انحراف کر کے انھیں اپنے پسندیدہ اور خودساختہ معانی کا لباس پہناتے رہنا، احادیث میں جہاں چاہا متن یا شرح میں ہاتھ کی صفائی دکھانا ورنہ فنِ رجال کی بحث چھیڑ کر شعبدہ بازی کا کمال پیش کرنا، ایمان اور کفر، توحید اور شرک کی حدود میں ایسی دھاندلی مچانا کہ عوام الناس کو عجیب پریشانی میں مبتلا کر دینا اور ایک ایسے چکر میں پھنسا دینا جس سے نکلنے کا انھیں بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

تصانیف اکابر سے وکُتبِ ائمہ سے عبارتیں نقل کرتے وقت من مانی عبارتیں بنالینا، اوّل یا آخر کا جملہ اڑا دینا، عبارت کے درمیان سے اپنے خلاف الفاظ کو ایسے انداز سے ہضم کر جانا گویا یہاں کوئی لفظ تھا ہی نہیں، اپنی طرف سے الفاظ گھڑ کر کسی بزرگ کی عبارت سے ملا کر سب کچھ ان کے سر تھوپ دینا، طرّہ یہ کہ اپنے ذہن سے کتابیں گھڑ لینا، اُن کے مطابع، صفحے اور عبارتیں تک اپنے ہی ذہن کی مشین سے ایجاد کر کے علمائے اہلسنت کو چیلنج کرتے رہنا کہ دیکھو جناب! تم ایسا کہتے ہو حالانکہ تمہارے فلاں فلاں بزرگ نے اپنی فلاں فلاں تصنیف کے فلاں فلاں صفحے پر تمہارے خلاف یوں لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ اُن کتابوں کا دنیا کے پردے پر کہیں نام و نشان نہیں ہوتا، کسی کتاب میں ان کا ذکر تک نہیں، ذکر کہاں سے ہو جبکہ یہ

مصنوعات ہی گھڑنت ساز فیکٹری کی ہیں۔ان حضرات نے اپنی انتہائی ہنر مندی اور کرشمہ سازی سے روافض کے کان بھی کاٹ رکھے ہیں۔

اُسی طائفہ سے ایک ایسی آواز اٹھے جو اُس کی پوری تاریخ کے علماء و مورخین کی تصریحات کے خلاف ہو، کیا ایسی آواز انصاف کی رُو سے قابلِ سماعت ہے؟

"میٹھی میٹھی ہپ، کڑوی کڑوی تھو" والی بات دوسری ہے ورنہ اِس طرح کس فرد یا جماعت کی تاریخ کو نہیں بدلا جا سکتا؟ کون سے ولی کو شیطان اور کون سے شیطان کو ولی ثابت کرنے کی جسارت نہیں ہو سکتی؟ لیکن سوال تو یہی ہے کہ ایسا کرنے سے کیا حقیقت ہی بدل جایا کرتی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو قریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد اتنی تکلیف اٹھانے، اپنوں کو مطعون کرنے اور اپنی ہی تاریخ کو بدلنے کا آخر فائدہ کیا؟ افسوس!

؎ متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

۱۶۔ جامع مسجد دہلی والا تاریخی مباحثہ تو پیشِ نظر ہوگا جو ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ میں ہوا تھا۔کیا غور نہیں کیا کہ ایک طرف ولی اللٰہی خاندان، تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خوشہ چین علمائے کرام اور اکثر علمائے دہلی ہیں تو دوسری طرف مذہب اہلسنت و جماعت سے بغاوت کرنے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبدالحئی صاحب ہیں۔اول الذکر جو متحدہ ہندوستان میں خارجیت و وہابیت کے بانی قرار پائے تھے، ان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اپنا مسلمان

ہونا ثابت کر دیجیے، اگر جناب کا ساختہ مذہب ہی اسلام کی صحیح تصویر ہے تو اپنے خاندانی اکابر مثل شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کو کس طرح بزرگ بلکہ مسلمان بھی مانا جا سکتا ہے؟ کیونکہ آپ کے نزدیک ان کا مذہب کفر و شرک بلکہ بت پرستی تک کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ موصوف نے جواب کی گنجائش نہ پا کر راہ فرار اختیار کرنے میں ہی خیریت سمجھی تھی۔ مولوی عبدالحیٔ صاحب نے مجبور ہو کر گفتگو تو کی لیکن ہر مسئلے میں معمولی سی قیل وقال کے بعد اہلسنت کا موقف تسلیم کرتے چلے گئے حتی کہ دستخط و مہر سے بھی گریز نہ کیا۔ یہ محض دفع الوقتی تھی ورنہ خارجیت سے اِن حضرات نے سرِ مو کنارا نہیں کیا تھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے مسلکِ اہلسنت اور اپنے خاندانی مذہب سے رُوگردانی کرنے کے باعث اپنے خاندانی علماء یعنی شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسیٰ پسران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کو بھی منہ دکھانا بند کر دیا، اِس طرح دینی حلقوں کے اس مرکز (خاندان عزیزی) سے موصوف کا رشتہ منقطع ہو گیا یہ سب کچھ منظور لیکن مذہب اہلسنت اختیار کرنا ساری عمر نامنظور ہی رہا۔ معلوم نہیں سید صاحب کے اس نامدار مرید نے جو اندرونِ خانہ سید صاحب کے رہبر اور اس سارے ڈرامے کو سٹیج کرنے والے تھے، انھوں نے یہ ساری کارگزاری انگریز دشمنی میں ہی دکھائی تھی؟

۱۷۔ اگر سید صاحب انگریزوں کے خلاف ہوتے تو انھیں مسلمانوں سے کٹ کر، اپنے اکابر کے مسلک کو چھوڑ کر، مذہب اہلسنت و جماعت سے منہ موڑ کر، علیحدہ اپنا محمدی گروہ بنانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ اگر یہ اقدام حکومت کی شہ پر نہیں تھا تو

اور کس ضرورت کے تحت تھا؟ اِس طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرکز سے رشتہ ٹوٹا، مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کا ساتھ چھوٹا، جامع مسجد دہلی کے سب سے پہلے حنفی وہابی مباحثہ ومناظرہ کے ذریعے بھی راہِ راست پر نہ آئے، پنجتار میں صدہا علماء ومشائخ نے اِنھیں بد مذہب ثابت کر کے مذہب اہلسنت قبول کرنے کی دعوت دی لیکن نامنظور ہوئی، جس کے باعث سرحد و پنجاب کے اکثر مسلمانوں جو حُسنِ ظن کے تحت ساتھی بن گئے تھے، اِن سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اِنھوں نے سرحدی مسلمانوں کو کلاب النار اور ملعونین اشرار ٹھہرا کر مستحل الدم قرار دے کر اُن کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کی، اُن کے اموال کو غنیمت سمجھ کر ہضم کرنا شروع کیا، اُن کے ننگ وناموس پر ڈاکے ڈالے تو اُن غیور مسلمانوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہونا قبول کرلیا لیکن اپنی سیاہ کاریوں اور بد مذہبی سے باز آنا کسی بھی مرحلے پر قبول نہ کیا۔ کیا سیّد صاحب اینڈ کمپنی کی یہ البیلی ادائیں، بانکی جفائیں، انگریز دشمنی کا کرشمہ تھیں؟

کرم کوشیاں ہیں، ستم کاریاں ہیں
بس اِک دل کی خاطر یہ تیاریاں ہیں

۱۸۔ سید احمد صاحب کے مذہبی رہنما یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے کمال اطاعت شعاری سے انگریزی منصوبے کے مطابق پیارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں تحریف کرنے اور شجرِ اسلام میں توحید کی آڑ لے کر غیر اسلامی عقائد ونظریات کی قلمیں لگاتے وقت خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کا قطعاً خیال نہیں رکھا

تھا۔ کیا اُسی برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کا خیال تک بھی سید صاحب اینڈ کمپنی کے قریب پھٹک سکتا تھا؟

۱۹۔ انصاف پسند حضرات سے التجا ہے کہ وہ سید صاحب کے ملفوظات، جنھیں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبدالحیٔ دہلوی نے "صراط مستقیم" کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کیا تھا، اس کی روشنی میں سید صاحب کی تصویر دیکھیں۔ بھلا جب تک مرزا غلام احمد قادیانی نے صریحاً دعویٰ ءِ نبوت نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے متعلق مجدِّد، مصلح، مہدی اور مسیحِ موعود وغیرہ ہونے کے دعوے کر رہا تھا اور پے در پے الہامات سنا رہا تھا، مرزائے قادیان کے اس دور اور سید احمد صاحب کے سارے کراماتی وطلسماتی دور میں فرق کیا ہے؟ دعویٰ نبوت کی مہلت ہی نہیں ملی تھی ورنہ وحی وعصمت تک کونسی صفتِ نبوت ہے جو سید صاحب نے اپنی ذات میں نہیں بتائی یا اِس متن پر حاشیہ چڑھانے والوں نے ان کے گلے میں نہ لٹکائی؟ باری تعالیٰ شانہ تک صعود، دیدارِ الٰہی، مصافحہ، مکالمہ، لین دین، عہد معاہدے، کلام حقیقی وغیرہ تک کے دعاوی سب موجود، چونکہ ان میں سے بعض چیزیں کتنے ہی انبیا کو بھی حاصل نہیں تھیں لہٰذا دعویٰ کر دیا کہ سید صاحب سرورِ کون ومکاں ﷺ کی مشابہت پر پیدا ہوئے ہیں۔ اے انصاف کے شیدائیو! اے کلمہ طیبہ کے ہمراہیو! کیا یہ سارے مراحل انگریز دشمنی میں طے کیے جا رہے تھے؟

ے بھلا دیتی ہیں سب رنج والم حیرانیاں میری
تری تمکینِ بے حد کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے

۲۰۔ پروفیسر صاحبانو! خدا کو حاضر و ناظر جان کر ایک صاحب صراطِ مستقیم کتاب پکڑ لیں اور دوسرے صاحب تقویۃ الایمان کو سنبھال کر بالمقابل بیٹھ جائیں۔ مضامین کا موازنہ کر کے دیکھ لیں، جو بات ایک میں جزوِ ایمان دوسری میں وہی بات کفر و شرک کا سامان، جو شخص اس کے نزدیک ولی دوسری کے نزدیک شیطان، اسی طرح اگر ایک کتاب دوسری کا ردنہ کر دے تو ہمارا ذمہ نہ کہیے! اِس سے زیادہ وضوحِ حق اور اتمام حجت اور کیا ہو سکتی ہے؟ حقیقت تو واقعی عیاں ہے لیکن اُن نازک مزاج مہربانوں کا کیا علاج، جو حقیقت کو مان لینے سے پہلے ہی نہ ماننے کی قسم کھائے بیٹھے ہوں۔ سوچیے تو سہی یہ کفر و ایمان کو شیر و شکر کرنے کی کارگزاری کیا انگریزوں سے ٹکرانے کی خاطر سر انجام دی جا رہی تھی؟ کہیں حکومت ہی کی شہ پر اپنا اور مسلمانوں کا دین و ایمان تباہ و برباد کرنے کے لیے تو ایسا نہیں کیا جا رہا تھا؟

قادری دین میں کہہ بھاگ خدا لگتی کچھ
مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

۲۱۔ اچھا جانے دیجیے ہر قسم کے بیانات کو، جائے غور ہے کہ انگریز جیسی دور اندیش، باریک بیں اور عیار قوم جس نے اپنے روزِ اوّل سے ہی مسلمانانِ ہند کو خاص طور پر اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا اور گرفت کو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا تھا، اگر اسے سید صاحب اینڈ کمپنی سے ایک فیصد بھی اپنی مخالفت یا اپنے نقصان کا اندیشہ ہوتا تو انگریز اپنی مملکت میں انھیں کھلے بندوں ہر قسم کی قوت جمع کرنے کی کیا ایک منٹ کے لیے بھی مہلت یا اجازت دینے کے روادار ہو سکتے تھے؟ کیا انگریز اتنے بیوقوف

تھے کہ خود اپنی آستین میں بصد شوق سانپ پال لیتے یا سید صاحب کے پاس اتنی طاقت کہیں سے اچانک آ گئی تھی کہ انگریزوں میں اُنھیں روکنے ٹوکنے کی طاقت و جرأت ہی نہ تھی؟

۲۲۔ زیادہ لکھنا، لمبے چوڑے دلائل پیش کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ خود اِن حضرات کے نزدیک، اِن کے جملہ مؤرخوں کے نزدیک، یہ سارا خانوادہ، اس کی تمام ذیلی شاخیں، سب کا وجود تک انگریز کی ہنرمندی کا مرہونِ منت ہے۔ اس لیے سید صاحب ہوں یا ان کا سارا محمدی گروہ، بعد میں اسی ڈگر پر چلائے جانیوالے شمس العلماء قسم کے حضرات ہوں یا مصلح و ریفارمر وغیرہ، یہ سب اور ان کی ساری جماعتیں، سب کے سب برٹش گورنمنٹ کے وفادار، اطاعت شعار بلکہ آلۂ کار بن کر رہے اور اس روش پر نازاں تھے، فخریہ اس کا چرچا کرتے اور گورنمنٹ کی مزید عنایات کے حقدار بنتے رہتے، مخالفین پر زبانِ طعن دراز کرتے، ان کی زبان بندی کرواتے اور "سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا" کے مصداق خوب مزے لوٹتے تھے۔ ماسوائے ان حضرات کے جو تحریک خلافت کے زمانے سے گاندھی کو اپنا امام و پیشوا بنا بیٹھے تھے، باقی حضرات کی ۱۹۴۷ء تک یہی کیفیت رہی۔ اُس وقت اس دوستی کا ظاہر کرنا باعثِ عنایات تھا لیکن جب انگریز دوڑ گئے، وہ چشم کرم ہی نہ رہی جس سے عنایتوں کی بارش ہوا کرتی تھی، بلکہ اب انگریز دوستی کے اظہار میں محض رسوائی کے سوا اور کچھ نہ تھا، اسی لیے یارلوگوں نے انگریزوں کے دوڑ جانے کے بعد الٹی گنگا بہانی شروع کردی کہ صاحبو! کیسی دوستی اور کہاں کی دوستی؟ انگریز سے ہمیں محبت نہیں

تھی، ہمارے بعض بزرگوں کا جو انگریزوں کی بارگاہ میں آنا جانا اور فیضیاب ہوتے رہنا تھا وہ کوئی آلۂ کار بننے کے لیے تھوڑا ہی تھا بلکہ صرف تفریحِ طبع کے لیے ایسا کیا جاتا تھا۔ رہا یہ کہ ڈیڑھ سو سال سے ہمارے علماء اور مورّخین لکھتے آ رہے ہیں کہ ہماری اور ہمارے چھوٹے بڑوں کی انگریز دوستی ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے تو اس قسم کی باتوں کا وہی لوگ یقین کرتے ہیں جنہیں انگریزوں سے کچھ بھی سیکھنے کا موقع نہیں ملا، ورنہ جب انگریز نہ رہے تو ہماری انگریز دوستی کہاں رہ گئی؟ دریں حالات جب ہم انگریزوں کے دوست نہ رہے تو اپنے بزرگوں کے ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکہ کیوں باقی رہنے دیں۔ یقین جانیئے اگر ہمارے وہ علماء اور مورخین زندہ ہوتے جو انگریز دوستی کے بیانات دیتے آ رہے تھے تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کی تاریخ کے پہلے ہی روز وہ حضرات بھی یہی کچھ کہہ اٹھتے جو آج ہم کہہ رہے ہیں اور فوراً اپنی اپنی تصانیف کے شروع میں "اعتذار" کی ایک ایک چٹ شامل کر دیتے، جس میں لکھا ہوا ہوتا کہ "اس کتاب کے فلاں فلاں صفحے پر کاتب کی غلطی سے جو انگریز دوستی لکھا گیا ہے، قارئین کرام اسے انگریز دشمنی پڑھیں، ہم اپنی کوتاہی پر معذرت خواہ ہیں، اگلے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے گی انشاءاللہ۔ لیکن ۔

بھلانے پہ بھی قصۂ ربطِ ماضی

بھلایا نہ جائے گا، ہم سے نہ تم سے

۲۳۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اپنی ساری تاریخ کو بدلنے کا ٹھیکہ لینے والے جناب غلام رسول مہر کی مندرجہ ذیل شہادت، خود ان کے اپنے لفظوں میں کافی رہے

گی:

"اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سید صاحب کس کے خلاف جہاد کی دعوت دے رہے تھے؟ آیا وہ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، جیسا کہ سوا سو سال سے سمجھا اور سمجھایا جارہا ہے اور وہ بھی محض اس بناء پر کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بہت ظلم کررہی تھی۔"

(غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۹)

موصوف اپنی سوا سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی سعادت حاصل کرنے والے ہیں کیونکہ یہ حقیقت موصوف کے جذبۂ عقیدت پر گراں گزرتی تھی۔ ثبوت میں اُس خط کے دو اقتباس پیش کیے ہیں جو سیّد احمد صاحب نے شاہ بخارا کو بھیجا تھا نیز والی ہرات کے نام لکھے گئے خط کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ ان میں سید احمد صاحب نے ہندوستان پر انگریزی تسلط کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ موصوف کے کھلے مغالطے ہیں کیونکہ صوبہ سرحد میں سید صاحب اینڈ کمپنی کو بدمذہب اور انگریزوں کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ وہ اگر دو چار لفظ انگریزوں کے خلاف نہ کہتے تو اور کیا یوں لکھ دیتے کہ "واقعی ما بدولت برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار ہیں۔" بدنامی کا داغ مٹانے اور مسلمانوں کو ساتھ ملانے کی غرض سے انگریزوں کے خلاف دو لفظ مصلحتاً کہنے کا تکلف فرمایا گیا تھا ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔

۲۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور سید احمد صاحب ایک ہی گاڑی کے دو پہیے، ایک جان اور دو قالب یا بمنزلۂ روح اور جسم تھے، اسی لیے ایک کو دوسرے سے جُدا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ دریں حالات گزشتہ سطور میں جو کچھ سید صاحب کے بارے میں لکھا گیا ہے اسے ان دونوں حضرات کے بارے میں سمجھا جائے کیونکہ اگرچہ بظاہر سید صاحب ہی مرشد یا امیر المؤمنین کی پوزیشن میں جماعت کے سرگروہ نظر آتے ہیں، لیکن اندرونِ خانہ اس سارے ڈرامے کو ترتیب دے کر پیش کرنے والے اور اس نوزائیدہ محمدی گروہ کے قافلہ سالار اور روحِ رواں، یہی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تھے۔

موصوف نے جب جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر وعظ کہنا شروع کیا اور اپنے بعض غیر اسلامی اور خلافِ مذہب عقائد و نظریات کی تبلیغ شروع کی تو دہلی کے عوام و خواص میں اور خصوصاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی کہ دن دہاڑے یہ کیا ہونے لگا؟ جس گلشن کی آبیاری یہ خاندان بڑھ چڑھ کر کرتا آیا ہے اسی خاندان کا ایک عالم اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو، عالمِ اسلام کے مذہب کو، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی آنکھیں بند ہوتے ہی، قربانی کا بکرا بنا کر خارجیت کے بت کی نذر کر رہا ہے۔ عوام و خواص نے دنگا فساد کی بجائے قانونی راستہ اختیار کیا۔ پندرہ سو مسلمانوں کے دستخطوں کے ساتھ ریزیڈنٹ کی خدمت میں اس وعظ کے خلاف درخواست پیش کی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ریزیڈنٹ کو حکّام اعلیٰ نے

اُس وقت تک موصوف کے بارے میں کوئی خصوصی ہدایت نہ بھیجی ہو، یہی وجہ ہے کہ لاعلمی میں پندرہ سو مسلمانوں کا پاس لحاظ کرتے ہوئے نیز امن وامان بحال رکھنے کی خاطر موصوف کا وعظ ممنوع قرار دے دیا اور بذریعہ کوتوال تحریری حکم بھیج دیا گیا۔

موصوف نے اعلیٰ حکّام کو اِس پابندی سے مطلع کیا ہوگا، اعلیٰ حکّام نے ریزیڈنٹ کو صورتِ حال بتائی ہوگی اور خصوصی ہدایات سے نوازا ہوگا، جس کی اطلاع موصوف کو مل گئی ہوگی، لہٰذا انھوں نے اپنے معاونین یعنی برادرانِ دینی ویقینی کو ساتھ لے کر ریزیڈنٹ سے ملاقات کی۔ ملاقات کے تیور ملاحظہ ہوں:

> "آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت ملنے ملانے اور فرصت کا ہوتا ہے، سیدھے کوٹھی پر پہنچے، ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا منشی ہیرالال تھا اور ایک خدمتگار تھا پہلے آپ نے جا کر اطلاع کرائی، جوں ہی ریزیڈنٹ نے سُنا کہ شاہ اسمٰعیل آئے ہیں فوراً باہر نکل آیا اور باہر برانڈے سے آ کر لے گیا۔ حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا کہ آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا (یہ عقیدت!) معمولی مزاج پرسی کے بعد ریزیڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے، مولوی صاحب، ہمارے سر رشتہ دار (علامہ فضل حق خیرآبادی) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ

نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اُسی وقت حکمِ ثانی لکھوادیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۹۲)

جائے غور ہے، جہاں عوام کا احتجاج بے کار ہو کر رہ جائے، سررشتہ دار کی رپورٹ بیکار ثابت ہو جائے جس ریزیڈنٹ نے حکماً وعظ بند کیا تھا وہ اُلٹا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جائے اور فوراً وعظ جاری کرنے کا حکم نافذ کرے کیا مسلمانوں نے صورتِ حال کو سمجھ نہ لیا ہوگا؟ کیا کمپنی کی اس سازش کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ گئے ہوں گے؟ لیکن جہاں مغل بادشاہ (اکبر شاہ) بھی بے دست و پا ہو کر بیٹھ رہا ہو وہاں عوام الناس کیا کر سکتے تھے؟ بیچارے صرف خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے اور بامرِ مجبوری دین کی بیخ کنی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بصد حسرت و یاس جو ریمارک دیا وہ پورے حالات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے:

" جب یہ لوگ (مسلمانانِ دہلی) مولوی منطقی صاحب (علامہ فضل حق خیرآبادی) کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ "اسمٰعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا۔" یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو انھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا۔"

(ایضاً: ص ۹۰)

موصوف کے بارے میں اس سلسلے کی ضروری معلومات کا تذکرہ ہم گزشتہ ابواب میں تفصیل سے پیش کر چکے ہیں، اعادے کی ضرورت نہیں۔ اب اُن کے بیانات اپنی تحریکِ جہاد کے متعلق ملاحظہ ہوں:

"یہ بھی صحیح روایت ہے کہ اثنائے قیامِ کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسمٰعیل صاحب وعظ فرما رہے تھے، ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریزی پر جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی بے رو ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے۔" (محمد جعفر تھانیسری: سوانح احمدی، ص ۷۳)

مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے

" کلکتہ میں جب مولانا اسمٰعیل دہلوی صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا، آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا، ان پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے، ایک تو ان کی رعیت ہیں، دوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے، ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے، بلکہ اگر ان پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور

ہوتو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی
گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۴)

نیچری فرقے کے بانی جناب سر سید احمد خاں نے اپنے لفظوں میں یہ قصہ یوں سپرد قلم کیا تھا:

ایک مرتبہ وہ (مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی) کلکتہ میں سکھوں پر
جہاد کا وعظ فرما رہے تھے اثنائے وعظ میں کسی شخص نے ان
سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کا وعظ کیوں نہیں
کہتے؟ وہ بھی تو کافر ہیں اس کے جواب میں مولوی محمد
اسمٰعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں
مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی
رعایا ہیں اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض
ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ
ہوں۔"

(سر سید احمد خاں: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۲۹)

اپنے اکابر کی انگریز دوستی کا داغ مٹانے سے اپنے کو مجبور دیکھ کر اپنے امام مذہب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عاشقِ زار یعنی مولوی محمد منظور نعمانی سنبھلی کو ان الفاظ میں اعتراف کیے بغیر کوئی راستہ نظر نہ آیا:

" مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی

اعلان نہیں کیا، بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا
اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض موقعوں
پر آپ کی امداد بھی کی ہے۔"

(ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ، شہید نمبر، ۱۹۵۵ء، ص ۷۶)

مولوی محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ
فیصلہ کن بیان دیا ہے:

"سر سید نے اس مضمون میں یہ بات بار بار لکھی ہے کہ حضرت
سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید، انگریزی حکومت
کے ہرگز ہرگز مخالف نہ تھے اور نہ ہی انھوں نے کبھی ان کے
خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ سر سید کے اس بیان کی تائید بعد
کے متعدد مؤرخوں نے بھی کی ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن
نے ترجمان وہابیہ مطبوعہ امرتسر کے صفحہ ۲۱، ۸۸ پر، نیز سوانح
احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری میں بیس مقامات پر، اسی طرح
حضرت شاہ اسمٰعیل کی سوانح موسوم حیات طیبہ کے صفحہ
۱۸۹، ۲۹۲، ۲۹۴ پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر حال میں
بعض اصحاب نے ان حقائق کے برخلاف یہ لکھنا شروع
کر دیا ہے کہ حضرت سید احمد رائے بریلوی اور حضرت شاہ
اسمٰعیل کا اصل مقصد انگریزوں کے خلاف جہاد تھا۔ لیکن
ظاہر ہے کہ ایسے حضرات کا یہ بیان واقعات کے مطابق نہیں

اور نہ اس دعوے کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے۔"

(محمد اسماعیل پانی پتی، مولوی: مقالات سرسید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور ص ۲۰۷)

۳۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی

آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے، داماد اور جانشین تھے۔ چونکہ مولوی محمد اسمٰعیل جو حضرت کے بھتیجے اور مولوی عبدالحئی بڈھانوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء) جو شاہ صاحب کے داماد تھے یہ خاندان عزیزی کے مسلک سے بغاوت کر چکے تھے، اس لیے آپ نے اپنے وصال سے قبل ہی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ یہ کیوں بدلے؟ پس منظر ملاحظہ ہو۔ حالات کے بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی سید احمد صاحب کے نامور خلیفہ اور ان کی تحریک جہاد کے سرگرم کارکن مولوی محبوب علی صاحب کسی زمانے میں مسلمانانِ سرحد کے بارے میں یہ فتوی صادر فرما رہے تھے:

"سکھوں سے زیادہ ان کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۳)

جب انھوں نے دیکھا کہ ہمارے مجاہدین سکھوں کا نام لے کر مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں۔ ان کی جانوں اور اموال کو اپنے لیے حلال ٹھہرایا ہوا ہے اور ان کے ننگ و ناموس سے کھیل رہے ہیں۔ تو ان کا ضمیر کچھ بیدار ہوا یا اسلامی غیرت نے کچھ رنگ دکھایا یا کلمہ گوئی کا کچھ پاس لحاظ سامنے آیا، کہ برملا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے:

"تمہارے اوپر زوجہ، بچوں اور والدین کے حقوق ہیں، تم ان سب حقداروں کے حقوق تلف کر کے یہاں بیٹھے ہو۔ جب لوگوں نے کہا، جہاد کے واسطے بیٹھے ہیں، تو مولوی صاحب نے کہا کہ جہاد کہاں ہے اور کس دن تم نے کون سے کافر کو قتل کیا ہے اور کون سے ملک میں تمہارا عمل دخل ہے؟ صبح سے شام تک کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو، جہاد کا نام لینا ایک دیوانہ پن ہے۔ بعض لوگ اس حیلے سے یہاں عیش کرتے ہیں اور تمہاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں۔"

(محمد جعفر تھانیسری، منشی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۳۵)

مولوی محبوب علی نے جب ساتھیوں کو یوں لاجواب کیا حتی کہ سید صاحب پر بھی اعتراضات کیے اور وطن واپس لوٹ آئے تو اس تحریک کو بہت نقصان پہنچا، کیونکہ چندے کی فراہمی اور دہلی وغیرہ مراکز سے چندہ پہنچانے میں آپ نمایاں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی اس موقع پر ظاہر ہو گئے کہ اس تحریک سے موصوف بھی کسی قدر وابستہ ہو چکے ہیں۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اس امر کی یوں تصریح کی ہے:

"مولوی محبوب علی کے اغوا سے جو کاروبارِ جہاد کو صدمہ پہنچا، ویسا صدمہ اس لشکر کو آج تک کسی سکھ یا درانی کے ہاتھ سے نہ پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی کے فتنہ کے بعد مدت تک ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہو گیا، اکثر معاونینِ جہاد

ست ہو گئے۔ جب بہت سے خطوط مولوی محبوب علی کی
تکذیب میں لشکرِ مجاہدین سے ہندوستان میں آئے تب
مدتوں کے بعد مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد
یعقوب صاحب معاونینِ جہاد کی سعی سے یہ فتنۂ محبوبی رفع
ہو کر خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔"

(محمد جعفر تھانیسری، منشی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۳۸)

موصوف اس دوران میں چونکہ تقویۃ الایمانی خیالات کے زیر اثر آ چکے تھے اور دوسری طرف تیرھویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی کا شرف بھی حاصل تھا، ان حالات میں فریقین کو خوش رکھنے کے لیے گول مول فتوے دیا کرتے تھے۔ جو باتیں تقویۃ الایمان میں کفر و شرک بتائی گئی ہیں، ان میں سے بعض کو ناجائز، بعض کو مکروہ وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے۔ لیکن موصوف اپنی اس روش سے کسی فریق کو بھی خوش نہ کر سکے۔ مبتدعین نے تو ان کی اس روش کو بھی غنیمت سمجھا لیکن اہلسنت کے زمرے میں جب موصوف کی ساکھ زیادہ گرنے لگی، اکثر اہلِ علم ان کی اس روش سے آگاہ ہونے لگے تو آپ نے اپنی پوزیشن کو مزید خراب ہونے سے بچانے کی غرض سے ہجرت کو مناسب سمجھا، چنانچہ موصوف معرکۂ بالاکوٹ کے دس سال بعد یعنی ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں مقدس سرزمینِ حجاز کو ہجرت کر گئے اور باقی وقت وہیں گزارا۔ چونکہ اس اہلسنت سے علیحدہ ہونے والوں کے گروہ کی قیادت آپ کے سپرد تھی لہٰذا جاتے وقت مختلف حضرات پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے، جو اس نوزائیدہ محمدی گروہ کا سرپرست بنایا گیا۔

۴۔ مولوی محبوب علی

یہ سید احمد صاحب کے مرید و خلیفہ اور ان کی تحریکِ جہاد کے سرگرم کارکن تھے۔ آخر میں اپنے پیر کے جہاد کو فراڈ یا فساد سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے تھے، جیسا کہ پیچھے مذکور ہوا۔ انگریز دوستی کے سلسلے میں اپنے مرشد اور اپنی جماعت کی طرح ثابت قدم رہے۔ موصوف کے بارے میں سر سید احمد خاں نے یوں لکھا ہے:

"شاید اس مضمون کے پڑھنے والے اس عجیب بات کے سننے سے بھی خوش ہوں کہ مولوی محبوب علی صاحب وہی شخص تھے جن کو ۱۸۵۷ء میں باغیوں کے سرغنہ بخت خان نے عین ہنگامۂ غدر میں طلب کیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ آپ اس زمانے میں انگریزوں پر جہاد کرنے کی نسبت ایک فتویٰ پر اپنے دستخط کریں۔ مگر مولوی محبوب علی نے صاف انکار کیا اور بخت خاں سے کہا کہ ہم مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور طرّہ بریں یہ ہوا کہ جو ایذا بخت خاں اور اس کے رفیقوں نے انگریزوں کی میموں اور بچوں کو دی تھی اس کی بابت بخت خاں کو سخت لعنت ملامت کی۔" (سر سید احمد خان: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، بار اول ۱۹۴۹ء، ص ۳۲)

۵۔ مولوی کرامت علی جونپوری

تذکرہ علمائے ہند کے مرتب پروفیسر محمد ایوب قادری نے موصوف کے بارے میں یوں تصریح کی ہے:

"جون پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ احمد علی چریا کوٹی، مولانا احمد اللہ انامی اور مولانا قدرت اللہ رودولوی سے تحصیل علم کی۔ علمِ قرأت و تجوید سید ابراہیم مدنی سے حاصل کیا۔ سید احمد شہید کے مرید ہوئے۔ بنگال میں اسلام کی اشاعت کی۔ مولوی شریعت اللہ کی تحریک کا شدت سے رد کیا۔ انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔"

(محمد ایوب قادری، پروفیسر: حاشیہ تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی، باراول، ۱۹۶۱، ص ۳۹۶)

انگریز مؤرخ مسٹر ولیم ہنٹر نے ان کی انگریز نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"یہ بڑا ہی مبارک واقعہ ہے کہ جس ضلع (جون پور) سے ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ (اکبر) کے خلاف بغاوت کا فتویٰ شائع ہوا تھا، اسی نے ایک ایسا عالم بھی پیدا کر دیا جس کا فتویٰ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کو سختی سے منع کرتا ہے۔"

(ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۷۳)

مولوی کرامت علی جون پوری (التوفی ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء) کی انگریز دوستی کے بارے میں مولوی مسعود عالم ندوی یوں تصریح کرتے ہیں:

" مجاہدین اور اتباع سید احمد شہید کے سب سے بڑے واقف کار، مسٹر جیمس اوکنلی نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکے مخالف تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۱۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو دیا گیا، جسے خود ان کے پوتوں نے فخریہ ۱۹۱۴ء میں درج کرایا تھا۔ (وہ خوب صورت اور نظر زیب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں اُن کے صاحبزادے، مشہور ادیب، مولوی عبدالاوّل صاحب جون پوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے، اس کے علاوہ راقم بھی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحاب خاص کی روش سے بالکل الگ تھے۔"

(مسعود عالم ندوی، مولوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۶۸ھ، ص ۴۷)

۶۔مولوی مملوک العلی نانوتوی اینڈ کمپنی

مولوی مملوک العلی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) ہی کو مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) نے سرزمینِ حجاز کی طرف ہجرت کرتے وقت تشکیل کردہ بورڈ کا سرپرست بنایا تھا۔ موصوف نے انتہائی خاموشی سے انگریزی مقاصد و مفادات کوملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے دہلی کالج سے اینگلو انڈین علماء کی ایک ایسی کھیپ پیدا کی، کہ اُن کے ذریعے مسلمانوں کا تعلیمی نظام کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا اور دوسری طرف اِن تیار کردہ علماء نے انگریز کی موافقت میں فضا کو ہموار کرنے کا کام بڑی رازداری سے جاری رکھا۔ مولوی مملوک العلی کے بارے انگریزوں کی رائے کیا تھی، ملاحظہ فرمائیے:

> "دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتمد تھے۔ کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا مملوک العلی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ہر سالانہ رپورٹ میں اُن کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔ ایک موقع پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا مملوک العلی کو انعام سے بھی نوازا۔ صورت یہ ہوئی کہ ۱۵۔ ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار کیا۔ ۱۷ نومبر کے دربار میں ۲۷ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مولانا مملوک العلی مدرس اوّل کو خلعت سہ

پارچہ مرحمت ہوا۔"

(محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، باراول، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۶)

مولوی مملوک العلی کے شاگردوں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مدرسہ دیوبند کے بانیوں اور چلانیوالوں میں تھے، جیسے مولوی محمود الحسن دیوبندی کے والد مولوی ذوالفقار علی صاحب اور مولوی شبیر احمد عثمانی کے والد فضل الرحمٰن دیوبندی وغیرہ اس کھیپ کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں وضاحت کی ہے:

"مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقیناً آگے بڑھیں اور مسلمانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے نئے نظام تعلیم میں منسلک ہوکر خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس) تو خاص ان (مولوی مملوک العلی) کے اعزہ واقارب ہیں۔

ان کے علاوہ شمس العلماء ڈپٹی شیخ ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء)، پیرزادہ محمد حسین (سیشن جج)، خواجہ محمد شفیع

(جج)، خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء)،
مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی
(ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں جو اسی
دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم وبیش ان
تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں
خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو
سراہا اور حسنِ صلہ سے نوازا۔"

(محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، باراول، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۷)

۷۔ مولوی سمیع اللہ دہلوی

مولوی سمیع اللہ دہلوی کے بارے میں مولوی عبدالخالق قدوسی نے یوں تصریح کی ہے:

" آپ (مولوی مملوک العلی نانوتوی) کے تلامذہ میں سے
مولوی سمیع اللہ (دہلوی) بڑی شہرت کے مالک اور
گورنمنٹ کے معتمد علیہ آدمی تھے۔"

(ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶)

مولوی مملوک العلی صاحب کے دوسرے شاگرد مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے موصوف کی سوانح عمری لکھی اور ۱۹۰۹ء میں مطبع انوار الاسلام حیدر آباد دکن سے شائع کروائی۔ اُس کا ایک اقتباس پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کر کے نہ صرف موصوف کی انگریز

دوستی کا، بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار ہونے کا راز یوں فاش کیا ہے:

"۱۶ دسمبر ۱۸۸۴ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے ساتھ استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں اُنھوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک (جو برطانوی استعمار کے خلاف تھی) کو نقصان پہنچایا۔ اِن خدمات کے صلہ میں ان کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔"

(محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۸۴)

۸۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

موصوف بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کے کارناموں کے پیش نظر شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ برٹش گورنمنٹ کے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے ساری عمر قلم سے کام لیتے رہے اور مزے سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ انگریزی عنایات سے خوب فیضیاب ہوئے۔ قرآن کریم کا ترجمہ بھی کیا، مقصد یہی تھا کہ کلام الٰہی کی تعلیمات کو اپنے مخصوص نظریات کے مطابق ثابت کر کے دکھائیں، جیسا کہ سر سید احمد خاں، مرزا حیرت دہلوی اور کوئی دوسرے حضرات نے بھی اس دور میں کیا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ اور انگریزوں کا حکمران ہو کر ہندوستان کے باشندوں کو جبراً غلام بنا لینا موصوف کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی

مہربانی تھی اور اِس انعام خداوندی کا شکریہ اِن لفظوں میں ادا کرتے ہیں:

"خدا کی بے انتہا مہربانی اس کی مقتضی ہوئی کہ انگریز بادشاہ ہوئے"۔

(افتخار عالم بلگرامی: حیاتِ نذیر، مطبوعہ شمسی پریس دہلی، ص ۱۲۷)

"ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عملداری میں آنکھ کھولی ہے، خدا اِس کو ابدالآباد تک سلامت رکھے۔ (ایضاً: ص ۱۲۷)

موصوف کو مسلمانوں کے حکمران رہنے سے بھی وہ آرام نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا انگریزوں نے پہنچایا۔ ڈپٹی صاحب کا یہ بیان ان کے سوانح نگار نے ان لفظوں میں نقل کیا ہے:

"شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بنے تو ایسوں کی کہ جن کی عملداری میں ہم کو اپنی (مسلمانوں کی) سلطنت سے زیادہ آرام و آسائش ہے۔" (ایضاً: ص ۱۲۷)

۹۔ مولوی محمد احسن نانوتوی

مولوی محمد احسن نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء)، مولوی محمد مظہر نانوتوی اور مولوی محمد منیر نانوتوی کے حقیقی بھائی تھے۔ یہ جملہ حضرات دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی کے شاگرد اور قریبی عزیز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں موصوف بریلی کالج میں مدرس تھے۔ جنگِ آزادی کے وقت یوں اپنا رنگ دکھایا:

"۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو نمازِ جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب

نے بریلی کی مسجد نومحلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر
کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف
قانون ہے۔نواب بہادر خاں کمشنر بریلی مسٹر الیگزینڈر کے
بظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پورا اعتماد
تھا۔اس سلسلہ میں ایک انگریز مورخ رقمطراز ہے" پچھلی
صدی کے ..... محافظ (حافظ رحمت خاں) کے پوتے
خان بہادر نے کمشنر (بریلی) کی کوششوں کی پوری پوری
تائید کی اور کالج (بریلی کالج) سے منسلک ایک مولوی (محمد
احسن نانوتوی) نے مسجد میں تقریر کی اور اس میں بتایا کہ
حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ شرع ہے۔"

(محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۵۰)

موصوف نے انگریزوں کا حقِ نمک ادا کرتے ہوئے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو خلافِ شرع بتایا تھا، ان کی یہ تقریر گویا مسلمانانِ بریلی کی ایمانی غیرت اور جذبۂ حریت کے لیے ایک چیلنج تھی۔ جب سارے شہر میں ان کے خلاف غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی اور جان کا خطرہ تک پیدا ہوگیا، تو موصوف نے بریلی کو چھوڑنا گوارا کرلیا لیکن انگریز دوستی کو اپنے اکابر کی طرح چھوڑنا منظور نہ ہوا۔قارئین کرام درج ذیل اقتباس پر غور فرمائیں:

"اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگادی اور تمام مسلمان
مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہوگئے۔اگر کوتوالِ شہر شیخ

بدرالدین کی فہمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو ان کی جان
کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔' (ایضاً: ص ۵۱)

۱۰۔ مولوی عبدالاحد

موصوف کون تھے؟ اس کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے:

" مولانا محمد احسن (نانوتوی) کے دو بیویاں
تھیں..... دوسری بیوی بنارس والی تھیں، ان کو والدۂ
عبدالاحد کہتے تھے...... مولانا محمد احسن اپنی سوتیلی اولاد
مولوی عبدالاحد اور زینب بی کی ضروریات کا بہت خیال رکھا
کرتے تھے۔" (ایضاً: ۱۱۸، ۱۱۹)

اب موصوف کے لفظوں میں ہی مولوی عبدالاحد کا تفصیلی تعارف کروایا جاتا ہے:

" مولوی صاحب مرحوم، مولانا محمد احسن نانوتوی کے ربیب
تھے اور وہ ۱۸۵۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ مولوی
عبدالاحد کی تمام تر تعلیم و تربیت مولانا محمد احسن نے کی...
مولوی عبدالاحد چودہ سال کی عمر میں حفظِ قرآن کریم سے
فارغ ہوئے۔ مولانا محمد احسن سے درسِ نظامی کی تکمیل کی
اور ۱۸۶۹ء میں بریلی کالج سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۸۷۰ء

میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں تھرڈ ماسٹر مقرر ہو گئے ۰۰۰۰۰۱۸۷۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا، اسی سال انبالہ میں "رسالہ نمبر ۱۵ بنگال" کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔۱۸۸۴ء میں ملازمت کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میرٹھ میں وکالت کرنے لگے۔

۱۸۸۶ء میں مولوی عبدالاحد نے منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی سے مطبع مجتبائی دہلی پانچسو روپے میں خریدا کیونکہ منشی ممتاز علی حجازِ مقدس کو ہجرت کر گئے۔ مولوی عبدالاحد مرحوم نے مطبع مجتبائی کو بہت ترقی دی اور دراصل یہی مطبع ان کی شہرت و نیک نامی اور دولت و امارت کا سبب بنا۔ پہلے یہ ایک معمولی سا مطبع تھا، مولوی صاحب مرحوم نے اِس کو بہت ترقی دی اور جلد ہی یہ مطبعِ برِصغیر پاک و ہند کے مشہور مطابع میں شمار ہونے لگا اور ایسا شہرت پذیر ہوا کہ آج تک اس کی ساکھ قائم ہے۔ "

(محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۰، ۱۶۲)

موصوف نے مولوی بشیر الدین احمد (المتوفی ۱۹۲۷ء) کی تصنیف " واقعاتِ دارالحکومت دہلی" جلد دوم، مطبوعہ شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء کے صفحہ ۱۹۱ سے مولوی عبدالاحد کے بارے میں ایک اقتباس یوں نقل کیا ہے:

" دِلّی کے نہایت سربرآوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے۔

قومی کاموں میں بہت دل چسپی لیتے ہیں۔علی گڑھ کالج
کے ٹرسٹی ہیں۔آنریری مجسٹریٹ ہیں۔اسی سال (۱۹۱۸ء
میں آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا ہے۔دہلی میں ایسا کوئی
قومی جلسہ یا اہم کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ
ہوں۔دل کھول کر قومی کاموں میں جان و مال سے شرکت
کرتے ہیں۔جامع مسجد، مسجد فتح پوری، عرب اسکول، یتیم
خانوں وغیرہ کے ممبر ہیں۔"

(محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۶۳، ۱۶۴)

موصوف کی اسی دریا دلی کے بارے میں یوسف بخاری کی کتاب "یہ دلّی ہے" کے
صفحہ ۱۱۳ سے جامع مسجد دہلی کے امام شمس العلماء سید احمد صاحب کا ایک بیان پروفیسر
محمد ایوب قادری نے نقل کیا ہے جو موصوف نے ۳ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ / ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء
کو دیا تھا۔اس بیان کا آخری حصہ ہدیۂ قارئین ہے:

" قوم کے کاموں اور تعلیمی اداروں میں انھوں نے بڑی
فراخدلی سے چندے دیے۔علی گڑھ کالج، عربک دہلی کالج
اور انجمن مؤید الاسلام کے بے حد دلدادہ تھے اور ہمیشہ ان کی
مالی امداد کرتے رہے۔حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج میں
شاندار خدمات ان سے انجام پائیں۔حکیم صاحب ان کا عمر
بھر اعتراف کرتے رہے۔" (ایضاً ص ۱۶۴، ۱۶۵)

ان جملہ مشاغل کے ساتھ موصوف کا برٹش گورنمنٹ کے ساتھ کیا رویّہ تھا؟ انگریزی

حکومت اور عام مسلمانوں نے آپ کو کس نظر سے دیکھا؟ ان تینوں سوالوں کا جواب مندرجہ ذیل عبارت میں تلاش کیجیے:

"پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴-۱۵ء میں مولوی عبدالاحد نے حکومتِ برطانیہ کی بے مثال خدمت انجام دی۔ انھوں نے وار فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ قرض جنگ میں دیا۔ انھوں نے سٹی ریکروٹنگ کمیٹی اور پبلسٹی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ برطانیہ نے مولوی عبدالاحد مرحوم کو خلعت، سند اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔

۲ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مولوی عبدالاحد کا انتقال ہوا۔ اس زمانے میں خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ حکام رس اور خطاب یافتہ حضرات کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، لہٰذا بعض لوگوں نے مولوی عبدالاحد مرحوم کی تدفین میں سخت رکاوٹیں ڈالیں۔ "

(محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۶۵)

۱۱۔ میاں نذیر حسین دہلوی

میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) موضع بلتھوا مضافات سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہار) میں بقول مصنفِ "الحیاۃ بعد المماۃ" ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ موضع بلتھوا سیدوں کی بستی تھی لیکن جس طرح مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی متحدہ ہندوستان کے شہرہ آفاق علمی وروحانی خاندان یعنی خاندان عزیزی کو لے ڈوبے اور ایک بھی قابلِ ذکر فرد کا نشان باقی نہ رہا۔ اسی طرح میاں صاحب کی بستی میں سیدوں کا ایک بھی گھر باقی نہ رہا بلکہ موصوف کے سوانح نگار کی تصریح کے مطابق وہاں صرف جولا ہے آباد ہیں۔ موصوف کا ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔ شاہ اسحاق دہلوی نے حدیث کی سند حاصل کی، جس کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں:

> "مولوی نذیر حسین ولد جواد علی سورج گڑھ ضلع مونگیر (بہارِ) میں ۱۲۲۰ھ/۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے ۱۶ سال کے بعد علم کی طرف میلان ہوا۔ ۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء میں وطن سے پوشیدہ طور پر صادق پور پہنچے وہاں کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۹ء میں دہلی میں پہنچے۔ پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں ٹھہرے۔ مولوی عبدالخالق دہلوی، اخوند شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین ہروی، مولوی کرامت علی بنی اسرائیلی، مولوی محمد بخش، مولوی عبدالقادر

رامپوری (المتوفی ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء) تلمیذ مفتی شرف الدین رامپوری سے جملہ علوم حاصل کیے۔ حدیث کی اجازت شاہ محمد اسحاق دہلوی (ف ۱۲۶۲ھ/۴۶-۱۸۴۵ء) سے حاصل کی۔ نواب مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی، عبدالرحمٰن محدث پانی پتی کا بیان لکھتے ہیں کہ :۔ جس روز شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کر کے حجاز روانہ ہوئے تو اس روز نذیر حسین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اولیت کی ایک ایک حدیث پڑھی اور کُل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر یہی واقعہ لکھ دیا۔ اس سے پہلے مدرسہ میں کبھی پڑھنے کو نہیں آئے۔"

(محمد ایوب قادری، تذکرہ رجال حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۸۳)

سند حاصل کرنے کے اس واقعے کو میاں صاحب کے سوانح نگار، مولوی فضل حسین بہاری نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور واقعے کو خلط ملط کرتے ہوئے اصلیت کا صرف اتنا اعتراف کیا ہے:

" مولانا محمد اسحاقؒ نے ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کی اور اُسی سنہ میں بہ وقت رخصت میاں صاحب کو ان سے سند و اجازت تحریری حاصل ہوئی۔"

(فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، مطبوعہ ضیا پریس کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۵۹)

موصوف کی سند پر اکثر علماء معترض ہوا کرتے تھے کہ پلے تو ہلدی کی ذرا سی گانٹھ ہے لیکن پنساری بنے بیٹھے ہیں۔ کہاں باقاعدہ سند و تدریس سے محروم اور کہاں شیخ الکل ہونے کا پروپیگنڈا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک واقعے کا تذکرہ میاں صاحب کے سوانح نگار نے یوں کیا ہے:

> "ایک روز مولوی احمد علی صاحب مرحوم سہارن پوری کو میاں صاحب نے خفا کر کے فرمایا: میں چپڑاس نہیں دکھاتا ہوں۔ تم بیٹھو میں صحاح پڑھاتا ہوں، دیکھو روش محدثانہ رکھتا ہوں یا نہیں؟ اکثر ایسے موقع پر شوخیِ طبع سے سند کو چپڑاس کے لفظ سے تعبیر کرتے۔" (ایضا: ص ۶۸)

میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت ایک انگریز عورت کی جان بچائی تھی۔ ساڑھے تین مہینے اُسے اپنے مکان پر رکھنے کے بعد انگریزوں کے کیمپ میں پہنچا دیا تھا۔ خصوصاً اس واقعے کے بعد ان کی نگاہوں میں برٹش گورنمنٹ اور حکومت کی نظر میں میاں صاحب کیا تھے؟ یہ پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

> "۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی۔ ساڑھے تین مہینے تک رکھا۔ جس کے بدلے میں ایک ہزار تین سو روپیہ انعام اور خوشنودی سرکار کا سرٹیفکیٹ ملا جس زمانہ میں (۱۸۶۴-۶۵ء) وہابیوں (غیر مقلد وہابیوں) پر مقدمے

چل رہے تھے، میاں نذیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہِ
وہابیان احتیاطاً ایک برس تک راولپنڈی کی جیل میں نظر بند
رکھا گیا تھا مگر بقولِ مولفِ الحیوٰۃ بعد المماۃ وفادارِ
گورنمنٹ ثابت ہوئے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ جب
میاں نذیر حسین حج کو گئے تو کمشنر دہلی کا خط ساتھ لے گئے۔
گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو شمس
العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں انتقال
ہوا۔"

(محمد ایوب قادری: تکملہ تذکرہ علماء ہند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۹۵)

خطاب ملنے کے واقعے کو موصوف کے سوانح نگار نے بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے
ہیں:

" گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء مطابق
۲۱ محرم ۱۳۱۵ھ روز سہ شنبہ کو ملا۔ جن لوگوں کو شیخ کے دیکھنے
اور کچھ دنوں بھی ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہے وہ اچھی
طرح سمجھ سکتے ہیں کہ عموماً خطاب پانے والے خطاب کے
لیے جو کچھ کرتے ہیں آپ کی طبیعت میں بالفطرۃ اس کا مادہ
ہی نہ تھا۔ وہ تدیّن، زہد و تقویٰ اور درویشی میں جس طرح
ثابت قدم اور مستقیم الحال تھے ویسے ہی ان امور کی جانب
سے نہایت ہی لا ابالی اور بے پروا تھے۔ معلوم ہوا کہ جس

وقت کمشنر دہلی نے بحکمِ لیفٹننٹ گورنر پنجاب، گورنمنٹ کی
طرف سے اس خطاب کی خبر آپ کو دی، اس سے ایک منٹ
آگے میاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات
نہیں آئی تھی کہ میں اس عام لقب سے ملقب ہوں گا اور
جب لوگ خلعت و خطاب کے ساتھ میاں صاحب سے
ملے اور آپ کو اس سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم
غریب آدمی خلعت و خطاب لے کر کیا کریں گے؟ خلعت و
خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے۔ ہم کو دنیا لاحل ہے۔
بعد اس گفت و شنود کے آپ نے اسی قدر فرمایا: "اچھا آپ
حاکم ہو، جو چاہو کہو۔"

(فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، ص ۱۸۰، ۱۸۱)

جب میاں نذیر حسین صاحب کے وفادارِ حکومت ثابت ہونے کی بات چل نکلی ہے تو
کیوں نہ اس سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار ہی سے پوچھا جائے؟ چنانچہ وہ لکھتے
ہیں:

"اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ میاں صاحب
بھی گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔ زمانہ غدر
۱۸۵۷ء میں جب کہ دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی
مولویوں نے انگریز پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے
نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔ وہ خود فرماتے تھے کہ: میاں وہ ہلڑ

تھا، بہادر شاہی نہ تھی۔ وہ بیچارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرتا؟
حشرات الارض خانہ براندازوں نے تمام دہلی کو خراب،
ویران تباہ اور برباد کر دیا۔ شرائطِ امارت و جہاد بالکل مفقود
تھے۔ ہم نے تو اس فتوے پر دستخط نہیں کیا، مہر کیا کرتے اور
کیا لکھتے؟ مفتی صدرالدین خاں صاحب چکر میں آ گئے۔
بہادر شاہ کو بھی سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں ہے
مگر وہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے، کرتے تو
کیا کرتے؟" (ایضاً: ص ۱۲۵)

مولوی محمد اسمٰعیل نے جس داؤد ظاہری والے فتنے کا سنگِ بنیاد بھی رکھا تھا، اسی ترکِ تقلید کی میاں نذیر حسین دہلوی نے موصوف کے بعد کھل کر سرپرستی کی اور اس طرح غیر مقلدین کا ایک علیحدہ فرقہ معرضِ وجود میں آ گیا۔ علمائے اسلام نے سمجھانے بجھانے اور ردّ و تردید کے ذریعے خوب اپنا فریضہ ادا کیا لیکن موصوف پر کوئی اثر نہ ہوا اور حکومت کی سرپرستی میں بے مہار ہی دوڑتے بھاگتے رہے۔ ۱۳۰۰ھ میں میاں صاحب نے حجِ بیت اللہ کا ارادہ کیا جانے سے پہلے موصوف نے اپنے خداوندِ نعمت، کمشنر دہلی سے چٹھی حاصل کی جو الحیات بعد الممات کے صفحہ ۱۳۹ پر انگریزی میں درج ہے۔ وہاں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

" مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں،
جنھوں نے نازک وقتوں میں اپنی وفاداری گورنمنٹ

برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے۔ وہ اپنے فرض زیارت کعبہ کے ادا کرنے کو مکہ جاتے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جس کسی برٹش گورنمنٹ افسر کی وہ مدد چاہیں گے وہ ان کو مدد دے گا کیونکہ وہ کامل طور سے اس مدد کے مستحق ہیں۔

دستخط جے۔ ڈی۔ ٹریملٹ بنگال
سروس کمشنر دہلی و سپرنٹنڈنٹ
۱۰ اگست ۱۸۸۳ء"

(فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، ص ۱۴۰)

موصوف نے دوسری چٹھی اس انگریز افسر سے حاصل کی تھی، جس کی بیوی کو میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ساڑھے تین ماہ اپنے گھر میں رکھا اور اس کی جان بچائی تھی۔ چنانچہ سوانح نگار نے لکھا ہے:

"دوسری چٹھی مسٹر لیسنس نے بنام کونسل مقیم جدہ کے دی، جس میں آپ کی خیر خواہیِ زمانۂ غدر کا مفصل بیان تھا۔ انھوں نے یہ بھی جتا دیا تھا کہ ان کے مخالفین بھی بہت ہیں اور ان میں سے بعض مکہ معظمہ میں یہاں سے بھاگ کر مقیم ہوگئے ہیں۔ مسٹر لیسنس نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ برٹش گورنمنٹ کا نسل کا فرض ہے کہ اِن کو اِن کے مخالفین کے شر و فساد سے بچائے۔ یہ چٹھی برٹش کانسل مقیم جدہ (مکتوب الیہ) نے اپنے پاس رکھ لی" (ایضاً: ص ۱۴۰، ۱۴۱)

میاں صاحب سے مکّہ مکرمہ میں باز پرس ہوئی، تو حاکمِ مکہ معظّمہ کے سامنے موصوف نے یہ بیان دیا:

"ہندوستان میں اس وقت انگریزی حکومت ہے۔ وہاں ہر مذہب والا آزادی کے ساتھ اپنے شعار مذہب کے ادا کرنے کا مجاز ہے۔ کوئی مسلمان نہ جمعہ سے روکا جاتا ہے نہ جماعت سے اور یہاں اسلامی سرزمین اور مسلمانوں کی حکومت میں ہم لوگ طوافِ کعبہ اور جمعہ و جماعت سے مجبور ہیں۔ اس کے بعد ہم یہ کہنے سے معذور سمجھے جائیں کہ انگریزی گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں (وہابیوں) کے لیے خدا کی رحمت ہے۔"

(فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد الممات، ص۱۶۱،۱۶۲)

میاں صاحب اپنے غیر مقلد گروہ کے سرپرست اور شیخ الکل تھے۔ موصوف کے دستِ راست اور فعّال کارکن مولوی محمد حسین بٹالوی تھے۔ اِس سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں لکھا ہے:

"مولوی محمد حسین بٹالوی کی پوری پالیسی میں شمس العلماء شیخ الکل میاں نذیر حسین ممد ومعاون بلکہ سرپرست و سرخیل رہے اور صادق پور کے بجائے مرکز قیادت دہلی اور لاہور منتقل ہوگیا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار) آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس وجود میں

آئی، جس کے سب سے فعال کارکن مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اہلحدیث کانفرنس کی پالیسی بھی کم و بیش مولوی محمد حسین بٹالوی کے انداز پر رہی۔"

(محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۴۸)

ضروری ہوا کہ مولوی محمد حسین بٹالوی کا انداز معلوم کیا جائے تاکہ اِس جماعت کے سرپرست میاں نذیر حسین دہلوی کا حکومت کے بارے میں اور بھی واضح نظریہ سامنے آجائے۔

۱۲۔ مولوی محمد حسین بٹالوی

مولوی محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) حقیقت میں اس جماعت کی پالیسی کے علمبردار ہیں جس کا سنگِ بنیاد مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے رکھا تھا۔ وہابیت کی اپنے روزِ اوّل سے ۱۹۲۰ء تک وہی پالیسی رہی جو مولوی محمد حسین بٹالوی نے اختیار کی۔ چنانچہ غیر مقلد حضرات کے سرگروہ، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"۱۸۷۵ء میں مولوی محمد حسین سرگروہِ موحدّین لاہور، بجواب سوال و مسئلہ اور اس فتوے کے کہ آیا بمقابلہ گورنمنٹ ہند، مسلمانانِ ہند کو جہاد کرنا اور اپنی مذہبی تقلید میں ہتھیار اٹھانا چاہیے یا نہیں؟ یہ جواب دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ جہاد جنگ مذہبی بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا بمقابلہ

اُس حاکم کے کہ جس نے آزادی مذہبی دے رکھی ہے اور
از روئے شریعتِ اسلام عموماً خلاف وممنوع ہے اور وہ لوگ
جو بمقابلہ برٹش گونمنٹ ہند یا کسی اس بادشاہ کے کہ جس
نے آزادیٔ مذہب دی ہے، ہتھیار اٹھاتے ہیں اور مذہبی
جہاد کرنا چاہتے ہیں، کُل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحق سزا
کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔

پھر مولوی محمد حسین نے اپنے اِس دعویٰ اور جواب کی تصدیق
میں کُل علماء ملک پنجاب واطرافِ ہند کے پاس اپنے فتویٰ
جوابی کو بھیج دیا اور اچھی طرح سے مشتہر کیا اور کُل علماء ہندو
ملک پنجاب سے اس بات کی تصدیق میں اقرار مُہری اور
دستخطی کرالیا کہ عموماً مسلمانانِ ہند کو ہتھیار اُٹھانا اور جہاد
بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کرنا خلافِ مسئلہ سنت و ایمانِ
موحّدین ہے۔

اور نیز کل علمائے ملک پنجاب و ہند نے تائیدِ قول مولوی محمد
حسین کی، کی ہے اور اپنے اپنے دستخط ومہر کر کے مولوی محمد
حسین کو اس فتویٰ میں بہت سچّا اور پکا کہا ہے اور سب نے
اپنی اپنی رائے اسلامی و ایمانی سے اس فتوے کو قبول کیا ہے
اور جانا اور مانا ہے کہ بمقابلہ گورنمنٹ ہند فرقہ موحّدین کو

ہتھیار اٹھانا، خلاف اسلام وایمان کے ہے۔

پھر مولوی محمد حسین نے اس بات کی استدعا کی تھی کہ وہابیانِ ملکِ ہزارہ کے نزدیک ایک عام ایلچی بذریعہ مسلمانانِ ہند کے بھیجا جائے اور وہ مع اس فتویٰ کے جا کر اس ناسمجھ کو مطلع کردے کہ جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کے ممنوع ہے اور نیز ان کو آگاہ کردے کہ ان کی اس نافہمی کے خونریزی و قتال وجہاد پر سخت گناہ ثابت ہے اور سب کا گناہ ان کے سر پر وارد شرعی ہے اور چونکہ از روئے شریعتِ اسلام، برٹش گورنمنٹ ہند سے جہاد کرنا، خلافِ طریقہء اسلام وشریعت حقہ، کے ہے، اِس لیے ان کو خیر خواہیءِ گورنمنٹ ہند میں برابر مستعد رہنا چاہیے۔"

(صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی، نواب: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرت سر، ص ۱۲۰)

مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے فتویٰ میں انگریز کے خلاف جہاد کرنے کو ایمان اور اسلام کے خلاف قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے نہ صرف موصوف کے نزدیک بلکہ مولوی محمد حسین بٹالوی اور میاں نذیر حسین دہلوی کی تصدیق وتائید کرنے والے علمائے اہلحدیث کے نزدیک باغی اور مستوجب سزا ہیں۔ برسبیلِ تذکرہ یہاں جناب غلام رسول مہر کی تحقیق پر ایمان لانے والوں کی خدمت میں ایک گزارش ہی پیش کردی جائے۔ وہ گزارش یہ ہے کہ تمام غیر مقلدین علماء کے اس متفقہ فتویٰ کی روشنی میں سوچیے تو سہی! اگر آپ مہر صاحب کی پیروی میں سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے

جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف بھی کرنا چاہتے ہیں تو بخوشی کیجیے لیکن اس صورت میں جملہ وہابی علماء کے نزدیک وہ حضرات باغی اور مستحق سزا بنتے ہیں اور ان کا یہ اقدام اسلام اور ایمان کے خلاف قرار پاتا ہے۔ اگر اس فتوے کو نا قابلِ اعتبار سمجھا جائے تو ایسا کرنا غیر مقلد حضرات کی ساری کوشش کو ساقط الاعتبار ٹھہرانے کے مترادف ہوگا۔

اب قارئین کرام، مہر صاحب کی تحقیق پر ایمان لاکر سید احمد صاحب کے جہاد کا رُخ انگریزوں کی طرف کرنے والے حضرات اور علمائے اہلحدیث، یہ سارے حضرات اس امر کا فیصلہ فرمالیں کہ:

ا۔ غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی جہاد کا رخ حقیقتاً انگریزوں کی طرف تھا۔

۲۔ علمائے اہلحدیث فرماتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا اسلام اور ایمان کے خلاف ہے اور ایسا کرنے والا سزا کا حقدار اور باغی ہے۔

تینوں قسم کے حضرات خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ ان فریقین میں سے کون سا فریق قابلِ اعتبار نظر آتا ہے اور کون سا نا قابلِ اعتماد؟ ہماری اس سلسلے میں عاجزانہ التماس بس اتنی سی ہے کہ جس فریق کو بھی نا قابلِ اعتبار ٹھہرایا جائے اس سے از راہِ کرم ہمیں بھی مطلع کر دینا، تا کہ ہم ان سے محتاط رہیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کے مذکورہ فتوے کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کی تحقیق یہ ہے:

"مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکارِ برطانیہ کی وفاداری میں

جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" ۱۲۹۲ھ میں لکھا۔ انگریزی اور عربی زبانوں میں اُس کے ترجمے ہوئے۔ یہ رسالہ سر چالس اپچی سن اور سر جمیس لائل گورنرانِ پنجاب کے نام معنون کیا گیا۔ مولوی محمد حسین نے اپنی جماعت کے علماء سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعۃ السنہ کی جلد دوم شمارہ گیارہ میں بطورِ ضمیمہ شائع کیا، پھر مزید مشورہ اور تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔"

(محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵)

موصوف کے مذکورہ فتوے کے متعلق جناب مسعود عالم ندوی کی رائے کچھ اس طرح ہے

"معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی۔ اس رسالے کا پہلا حصہ پیشِ نظر ہے۔ پوری کتاب تحریف و تدلیس کا عجیب وغریب نمونہ ہے۔"

(مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۶۸ھ، ص ۲۹)

مولوی محمد حسین بٹالوی اپنے اس فتوے پر بے حد نازاں تھے اور اس کے ذریعے وہ اپنی ذات کو اور اپنی جماعت کو برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہوں میں سب سے ممتاز دکھانے اور ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ موصوف کے رسالہ "اشاعۃ السنہ"

لاہور، جلد ۸ کے صفحہ ۲۶۱، ۲۶۲ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے ان کا اسی فتوے کے سلسلے میں ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

"اگرچہ اس مضمون (منسوخی جہاد) کے رسائل گورنمنٹ اور ملک کے خیر خواہوں نے بھی لکھے ہیں لیکن جو ایک خصوصیت اس رسالے میں ہے وہ آج تک کسی تالیف میں پائی نہیں جاتی۔ وہ یہ ہے کہ یہ رسالہ صرف مولف کا خیال نہیں رہا، اس گروہ کے عوام وخواص نے ۰۰۰۰ اس کو پسند کیا اور اس سے اپنے آراء کا توافق ظاہر کیا۔ اس توافقِ رائے کو حاصل کرنے کے لیے مؤلف (محمد حسین بٹالوی) نے عظیم آباد پٹنہ تک ایک سفر کیا تھا، جس میں لوگوں کو یہ رسالہ سنا کر اتفاق حاصل کیا اور جہاں خود نہیں پہنچا وہاں اِس رسالے کی متعدد کاپیاں ارسال کر کے توافق حاصل کیا۔"

(محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵)

یوں تو کتنے ہی علماء برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار بن کر خفیہ یا اعلانیہ حمایت کا دم بھرتے اور انگریزوں کے تخریبی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی پوری پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے تھے لیکن انگریز کی علی الاعلان، ڈنکے کی چوٹ موافقت کرنے، جہاد کو منسوخ قرار دینے، انگریز کے مخالفوں سے ٹکر لینے میں مولوی محمد حسین بٹالوی، مرزا غلام احمد قادیانی اور سر سید احمد خاں علی گڑھی سب سے ممتاز ہیں۔ یہ تینوں حضرات آپس میں تو ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن کسی بھی چوتھی

ہستی کو، اس میدان میں، اِن حضرات کا مدِّ مقابل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ثبوت کے طور پر موصوف کا ایک بیان ملاحظہ ہو، جسے پروفیسر محمد ایوب قادری نے "اشاعۃ السنہ" لاہور جلد ۸، شمارہ ۹ کے صفحہ ۲۶۲ سے نقل کیا ہے:

"اس گروہِ اہلحدیث کے خیر خواہ و وفادار رعایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی روشن اور قوی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس امر کو اپنے قومی وکیل اشاعۃ السنہ کے ذریعہ سے جس کے نمبر ۱۰، جلد ۶ میں اِس امر کا بیان ہوا ہے (اور وہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے) گورنمنٹ پر بخوبی ظاہر اور مدلل کر چکے ہیں، جو آج تک کسی اسلامی فرقہ رعایا گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا اور نہ آئندہ کسی سے اِس کے ظاہر ہونے کی اُمید ہو سکتی ہے۔"

(محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷)

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت (غیر مقلد وہابی) اپنے روزِ اوّل ہی سے برٹش گورنمنٹ کی خیر خواہ اور وفادار تھی لیکن انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہو جانے کے بعد سید صاحب کے بعض کاروباری قسم کے مجاہد خلفاء کا انگریزوں سے ٹکراؤ ہوا، اُن کی تحریک کو مٹایا گیا، مقدمے چلے، سزائیں دیں۔ اِن حالات میں حکومت سے ناراضگی قدرتی امر تھا لیکن ایک طرف گورنمنٹ کا آہنی پنجہ تھا تو دوسری طرف مولوی

محمد حسین بٹالوی کی فہمائش۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پوری جماعت برٹش گورنمنٹ کی وفادار و خیر خواہ بن کر اُس کے استحکام و قیام کو اپنے لیے نعمتِ غیر مترقبہ گردانے لگے۔ اس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی یوں نغمہ سنج ہیں:

"گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہلِ حدیث نے کس قدر تسلیم کیا ہے اور اس کے کیسے فرمانبردار، مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں۔ اِن پر کیا، ہندوستان کے کل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی ان کارروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔"

(حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۶۷)

مولوی محمد حسین بٹالوی نے ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ جوبلی پر برٹش گورنمنٹ کی بارگاہ میں اپنا نذرانہ عقیدت نچھاور کرنے کی غرض سے جو ایڈریس پیش کیا تھا اس کا ایک اقتباس "اشاعۃ السنہ" لاہور، جلد ۹، شمارہ ۷ کے صفحہ ۲۰۵، ۲۰۶ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں نقل کیا ہے:

"یہ مذہبی آزادی اِس گروہ کو خاص کر اس سلطنت میں حاصل ہے بخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے کہ ان کو اور اسلامی سلطنتوں میں بھی یہ آزادی حاصل ہے، اس خصوصیت سے یقین ہوسکتا ہے کہ اس گروہ کو اس سلطنت کے قیام واستحکام سے زیادہ مسرت ہے اور ان کے دل سے بارک باد کی

صدائیں زیادہ زور کے ساتھ نعرہ زن ہیں۔"

(محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷)

اسی سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے:

"اِسی طرح لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی سبکدوشی پر جماعت اہل حدیث نے ایک خوشامدانہ ایڈریس دیا، جس پر سب سے پہلے شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط ہیں۔ اِس کے بعد ابو سعید محمد حسین وکیل اہلِ حدیث، مولوی احمد اللہ واعظ میونسپل کمشنر امرت سر، مولوی قطب الدین پیشوائے اہلِ حدیث روپڑ، مولوی حافظ عبداللہ غازی پوری، مولوی محمد سعید بنارسی، مولوی محمد ابراہیم آرہ اور مولوی نظام الدین پیشوائے اہلحدیث مدارس کے دستخط ہیں۔"

(ایضاً: ص ۲۷)

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد صاحب نے اپنی اس نوزائیدہ جماعت کا نام "محمدی گروہ" رکھا تھا۔ خلفاء کا دور آیا تو اپنے لیے "موحدین" اور مسلمانوں کو مشرکین بتانے لگے لیکن محمد بن عبدالوہاب کے نقشِ قدم پر چلنے کی بنا پر متحدہ ہندوستان کے مسلمان بھی اِنھیں اہلِ عرب کی طرح "وہابی" ہی کہا کرتے تھے۔ جب مقدمۂ انبالہ کے تحت انگریزوں نے اپنے خانہ زادوں کی گوشمالی شروع کی، جواب انگریزوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ اس پکڑ دھکڑ سے وہابی حضرات گھبرا اٹھے۔ اس موقع پر مولوی محمد حسین بٹالوی کام آئے۔ ایک طرف انھوں نے حکومت کے غصّے کی آگ

اپنی خوشامدانہ روش اور کاسہ لیسی کے پانی سے سرسیّد احمد خاں کی طرح بجھانی شروع کی اور دوسری طرف اپنی پوری جماعت کو حکومت کا وفادار بنادیا۔ اس جماعت کے ماتھے پر جو مسلمانوں نے وہابیت کی چٹ لگا رکھی تھی، اُسے اہلِ حدیث حضرات کے وکیل مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے سرپرستوں کے ذریعے قانونی طور پر ہٹانے کی کوشش کی اور اپنی جماعت کا نام جس طرح منکرینِ حدیث نے "اہل قرآن" تجویز کیا ہے، اِسی طرح اِن منکرین فقہ وتقلید ائمہ نے اپنی جماعت کو "اہل حدیث" کا نام دیا۔ مثلاً:

> " اِنھوں نے ارکانِ جماعت اہلِ حدیث کی ایک دستخطی درخواست لیفٹننٹ گورنر پنجاب کے ذریعہ سے وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کی، اُس درخواست پر سرِ فہرست شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وہ درخواست اپنی تائیدی تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی ۔ وہاں سے حسبِ ضابطہ منظوری آگئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے " اہلِ حدیث " کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے اِس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اِسی طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۵ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲۷، گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۶، اور

گورنمنٹ یو۔پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶ گورنمنٹ سی۔پی کی طرف ۱۴ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷، اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۱۴ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۳۲ اِس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین بٹالوی کو ملی۔ "

(محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۶)

موصوف کے مذکورہ بالا بیان کا ماخذ رسالہ "اشاعۃ السنہ" لاہور ہے۔اِس کی تائید میں سیرت ثنائی مطبوعہ گوجرانوالہ ۱۹۵۲ء کے صفحہ ۳۷۲ سے مولوی عبدالمجید خادم سوہدری کا ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

"(مولوی محمد حسین بٹالوی) نے اشاعۃ السنہ کے ذریعہ اہلِ حدیث کی بہت خدمت کی۔ لفظ "وہابی" آپ ہی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہلِ حدیث کے نام سے موسوم کیا گیا۰۰۰۰۰۰ (آپ نے) حکومت کی خدمت بھی کی اور انعام میں جاگیر پائی۔"

(محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۶)

۱۳۔ مولوی نواب صدیق حسن خاں قنوجی

آپ ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ / ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو اپنی نہال بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی والدۂ محترمہ قنوج چلی گئیں جو موصوف کا آبائی وطن تھا۔ درسی علوم مفتی صدرالدین دہلوی سے حاصل کیے، تفسیر وحدیث وغیرہ علوم قاضی حسین انصاری، شیخ عبدالحق ہندی اور مولوی محمد یعقوب دہلوی سے حاصل کیے۔ پہلے بھوپال میں ملازمت کی بعدہ ۱۲۸۸ھ / ۷۲۔۱۸۷۱ء میں رئیسۂ بھوپال کی شوہری ونیابت کا شرف بھی مل گیا۔ نوابی اور خان بہادری کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی اور مولوی محمد حسین بٹالوی کے ہم مسلک وہم مشرب تھے۔ تصنیف و تالیف کے ذریعے اور شانِ نوابیت کے بل بوتے پر اپنی جماعت کی جڑیں مضبوط کرتے رہے۔ انگریز دوستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ دار رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو نواب صاحب شرعی نقطۂ نظر سے کیا درجہ دیتے تھے، خود موصوف کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمایئے:

> "چنانچہ غدر (یعنی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) میں جو چند لوگ نادان، عوام الناس، فتنہ وفساد پر آمادہ ہوکر جہاد کا جھوٹ موٹ نام لینے لگے اور عورتوں اور بچوں کو ظلم وتعدی سے مارنے لگے اور لوٹ مار پر ہاتھ دراز کیا اور ہوالِ رعایا اور پرایا پر غصباً قابض ومتصرف ہوئے انھوں نے خطائے

فاحش کی اور قصور ظاہر، اس لیے کہ قرآن و حدیث کے موافق کہیں شرطیں جہاد کی موجود نہ تھیں، سوائے سودائے خام اور خیالی پلاؤ حکومت رانی اور ملک ستانی کے ان کے دلوں میں اور مغزوں میں سمائے ہوئے تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ ان میں سے کسی جماعت اور لشکر میں خلوصِ نیت اور پاکیِ طینت اور انصاف واجبی اور تبعیتِ مذہبِ اسلام ہو۔"

(صدیق حسن خاں قنوجی، نواب: ترجمان وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۲۴)

موصوف کی نظر میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سراسر ایک فتنہ و فساد تھا۔ چنانچہ تصریح کرتے ہیں کہ:

"آج کل عام مسلمان جن کو علم و فہم سے بہرہ نہیں بلکہ اکثر اربابِ دول و حکومت جنھیں اسلام کی خوبیوں سے اور ایمان کی باتوں سے بالکل واقفیت نہیں، جس کو جہاد سمجھ رہے ہیں، وہ حقیقت میں فتنہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔"

(ایضاً: ص ۲۸)

اسی سلسلے میں موصوف یوں اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہیں:

"جس کا جی چاہا اور اس کو وسوسہء سرداری نے گھیرا، وہی سرکار سے باغی ہو کر لڑنے کو کھڑا ہو گیا اور اِس لڑائی کو جہاد ٹھہرایا، حالانکہ وہ جہاد نہ تھا، سراسر فتنہ تھا۔" (ایضاً: ص ۳۰)

اسی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بارے میں موصوف نے یوں نوابی فیصلہ صادر فرمایا ہے:

"بغاوت جو ہندوستان میں بزمانۂ غدر ہوئی، اُس کا نام جہاد رکھنا ان لوگوں کا کام ہے جو اصل دینِ اسلام سے آگاہ نہیں اور ملک میں فساد ڈالنا اور امن اٹھانا چاہتے ہیں۔"

(ایضاً: ص ۱۰۷)

جن مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا، جو انگریز کی غلامی کا جؤا اپنے کاندھوں سے اُتار کر پھینک دینا چاہتے تھے اور جو اپنے ملک کو غاصب انگریزوں کے پنجے سے چھڑا کر آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے تھے، وہ تھے کون؟ اس سوال کا جواب نواب صدیق حسن خاں صاحب نے یوں دیا ہے:

"جتنے لوگوں نے غدر میں شروفساد کیا اور حکام انگلشیہ سے برسرِ عناد ہوئے وہ سب کے سب مقلدانِ مذہب حنفی تھے، نہ متبعانِ حدیثِ نبوی۔ مگر مکر اور زور کی راہ سے فتنہ پردازی کی تہمت دوسروں پر باندھ دی اور اہلِ غدر کو وہابی ٹھہرا دیا۔"

(صدیق حسن خاں قنوجی، نواب: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۴۷)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے مسلمانوں کا نواب صاحب کی نظر میں جرم کیا تھا، اُن پر کونسی دفعہ عائد ہوتی تھی؟ اس سلسلے میں شریعتِ محمدی کے ٹھیکیدار بننے والے نواب صاحب کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

"وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اس بادشاہ کے
کہ جس نے آزادگیِ مذہب دی ہے ہتھیار اٹھاتے ہیں اور
مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کُل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحق
سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔" (ایضاً ص ۱۲۰)

اب آخر میں ملاحظہ ہو کہ غیر مقلدانِ ہند کی نظر میں انگریز جیسی عیار، ظالم اور اسلام دشمن قوم کیسی تھی؟ پہلے باب کے اندر جس کے عیارانہ قبضے، ظالمانہ رویّے اور اسلام دشمن منصوبے کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے اُس کی روشنی میں نواب صاحب کی قصیدہ خوانی ہوسکتا ہے نمک حلالی کا ثبوت ہو لیکن مسلمانوں کی ایمانی غیرت کے لیے چیلنج ہے:۔

"غرض ان (قاضی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہوا کہ
درستیِ ملک اور صفائیِ راہ اور رفاہِ عوام اور امنِ خلائق اور
امانِ مخلوق اور راحت رسانیِ رعیت اور آرام دہیِ بریت میں
حکّامِ فرنگ کا مثل اور نظیر اِس وقت میں بلکہ اکثر اوقات
میں ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہر وقت کے مُلّا اور مفتی خوشامد کی راہ
سے باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں مگر میری
نظر میں جو راجح اور صحیح معلوم ہوا، وہ لکھ دیا۔ قبول و ہدایت
اللہ کے ہاتھ ہے۔"

(صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی: ترجمان وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۳۴)

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال، دانہ و دام سے گزر

۱۴۔ سر سید احمد خاں

سر سید احمد خان ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کی لیکن بے توجہی سے اور بہت کم۔ ابتدائی زندگی رنگا رنگ قسم کی ہے۔ حالی پانی پتی نے اُس کی یوں تصویر کشی کی ہے:

"سر سید کا عنفوانِ شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔ وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دِلّی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں میں ہوتے تھے، وہاں جاتے تھے۔ خود ان کے نانا فرید کی قبر پر چونسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا اس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔"

(الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۱۰۴)

سر سید احمد خاں اپنی سوانح حیات خود یوں بیان کرتے تھے:

"اول اول تو جب کبھی سر سید کے سامنے اور ان کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا، تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ:"

میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلوائے اور رکھا ہی کیا ہے؟"

(الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۷۱)

مولوی عبدالحق حقانی دہلوی نے سر سید احمد خاں کا تعارف یوں کروایا ہے:

"اِس کنبے میں ایک شخص سیّد احمد خاں صاحب بہادر بھی پیدا ہوئے۔ یہ شخص ابتداء میں مولوی مخصوص اللہ صاحب نبیرۂ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمت میں آ کر کسی قدر صرف ونحو سے آشنا ہوئے اور تعویذ گنڈے بھی سیکھے، لیکن جب یہ نسخہ نہ چلا تو گورنمنٹ برٹش کی طرف رجوع کیا اور اپنی لیاقتِ خداداد سے کوئی اچھا عہدہ بھی پایا، پھر تو پکے وہابی متبع مولوی اسمٰعیل صاحب ہوگئے ۔۔۔۔ اس عرصہ میں غدر ہوگیا اور سید صاحب اپنی خیر خواہی اور حکام رسی سے بڑی ترقی کر گئے اور اپنی خوش بیانی اور عالی دماغی سے انگریزوں میں بڑے فاضل یا فلاسفر باوقار مانے گئے اور سی۔ ایس۔ آئی کا لقب حاصل کیا اور کچھ عجب نہیں کہ گورنمنٹ برٹش ۱۸۵۷ء کے فساد سے پُر حذر ہو اور سید صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کو نہ صرف اطمینان دلایا

بلکہ خیالات مذہبیہ کے گرانے کا بھی بیڑہ اٹھایا ہو۔"

(عبدالحق حقانی، مولوی: تفسیر حقانی، جلد اوّل، ص ۱۱۲)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سر سید احمد خاں صاحب نے اپنی قوم کے خلاف اور اپنے ملکی مفادات کے خلاف دل کھول کر انگریزوں کی مدد کی۔ موصوف کے اِس کارنامے کو انگریزوں نے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور انھیں خوب مالا مال کیا۔ سر سید احمد خاں صاحب کی ان کارگزاریوں کے لیے دفتر چاہییں۔ تفصیلی حالات کے لیے اُن کی تصنیف "تاریخ سرکشیِ بجنور" بھی کافی ہے یہاں محض ایک جھلک دکھانے کی غرض سے اُن کے سوانح نگار یعنی خواجہ الطاف حسین حالی کا ایک بیان ہدیۂ انظارِ ناظرین ہے:

"جو شخص سر سید کی طبیعت اور جبلّت سے وقف ہوگا، وہ اس بات کو بآسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانہ میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری ان سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اس نازک وقت میں اِن سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔ مگر گورنمنٹ نے خود انکی خدمات کی قدر کی اور ان کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپے کا اور دو سو روپے ماہوار کی پولیٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی۔"

(الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۱۳۸)

موصوف کی نظر میں برٹش گورنمنٹ کیا اور کیسی تھی؟ خواجہ الطاف حسین حالی نے ان کا ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

"الٰہی تیرا بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برس تک تو نے اپنے ان بندوں کو جن کو تو نے خطۂ ہندوستان میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بسبب نہ ہوئے ان حاکموں کے ہماری شامتِ اعمال ہمارے پیش آئی، اب تو نے اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلط کیے۔ تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں، تو اپنے فضل سے اس کو قبول کر۔" (ایضا: ص ۱۵۱)

سید احمد خاں آخر برٹش گورنمنٹ کے اِتنے خیر خواہ کیوں بنتے تھے؟ اِس کی وجہ خود موصوف کی زبانی سنیے:

"انھوں (سر سید احمد) نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا کہ میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے اِستحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر

وہ (مسلمان) اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش
گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔"

(الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۶۸۳)

موصوف کے نزدیک انگریز مسلمانوں کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ اس خوش فہمی میں وہ دانستہ مبتلا ہونے پر مجبور تھے اور پوری قوم کو بھی اِس خوش فہمی کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ اس دعوے کی دلیل سر سید کے پاس وہ چند قوم فروش بلکہ دین فروش تھے جنھیں حکومت نے فکرِ دنیا سے آزاد کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کو موصوف جس قسم کی تلقین کیا کرتے تھے وہ خود سر سید احمد خاں صاحب کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائے:

" ہم (سر سید احمد خاں) جو یہ لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے، اِس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدر دان گورنمنٹ نے خیر خواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت و آبرو کی، انعام و اکرام اور پنشن و جاگیر سے نہال کر دیا ہے۔ ترقیِ عہدہ اور افزونی مراتب سے سرفراز کیا ہے۔ پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور اپنی گورنمنٹ کے شکر گزار اور ثنا خواں رہیں۔" (ایضاً ص ۱۵۷)

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے، لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

کاسہ لیسی کا اولین ریکارڈ دیکھنا ہو تو انگلش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی سر سید احمد

خاں صاحب کی زبانی سنیے اور مسٹر غلام احمد پرویز کو بھی سنائیے کیونکہ موصوف کی نظروں میں پاکستان کا حقیقی بانی سر سید تھا۔ انگریز کی چمچہ گیری پر مسلمانوں کو مجبور کرنے والا، مسلمانوں کا دینی وجود ختم کر کے انھیں زبانی مسلمان اور انگریزوں کا سائیس، کلرک اور دربان بنا رہا تھا یا پاکستان؟ خیر اب منطقی قصیدہ ملاحظہ ہو:

"اُن (سرسید) کی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن واماں کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ اُنھوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکروفریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سو اُسی ضرورت نے ہندوستان کو ان کا محکوم بنا دیا۔"

(الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۶۸۲)

کشتی دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

میں حیران ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کی چاپلوسی اور ملت فروشی میں سر سید احمد خاں کو اول نمبر قرار دوں یا مولوی محمد حسین بٹالوی کو؟ لیکن میں فیصلہ کرنے والا کون؟ اِس امر کا

فیصلہ تو خود قرائینِ کرام نے کرنا ہے۔ اِس سلسلے میں کیوں نہ موصوف کا ایک بسنتی فتوٰی بھی پیش کر دیا جائے:

"مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور مستامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں۔ وہ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں، نہ بغاوت، نہ کسی قسم کا فساد۔" (ایضاً: ص ۲۴۳)

چونکہ متحدہ ہندوستان میں وہابیت کو نجد سے درآمد کرنا، خود انگریزی حکومت کا کارنامہ تھا اور وہی اس کی سرپرست تھی۔ سرسید احمد خاں صاحب اِس نوازش کا شکریہ یوں ادا کرتے ہیں:

"وہابی جس آزادیِ مذہب سے انگلش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں رہتے ہیں، دوسری جگہ اِن کو میسر نہیں ہے۔ ہندوستان اِن وہابیوں کے لیے دارالامن ہے۔"

(محمد اسمٰعیل پانی پتی: مقالاتِ سرسید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۲)

اسی سلسلے میں موصوف کا اِس سے بھی واضح ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے:

"انگلش گورنمنٹ ہندوستان میں خود اس فرقہ کے لیے جو وہابی کہلاتا ہے، ایک رحمت ہے (جو ۱۹۴۷ء میں وہابیوں کو روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اختر) جس طرح ہندوستان میں کل مذہب کے لوگوں کو کامل آزادی ہے، جو سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں، اُن میں بھی وہابیوں کو ایسی آزادیِ مذہب ملنا

مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ سلطان کی عملداری میں وہابی کا رہنا
مشکل ہے۔" (ایضاً: ص ۲۱۲)

کیوں صاحبو! چودہ طبق روشن ہوئے یا نہیں؟ مسلمان بادشاہ کی حکومت میں آخر وہابی کا رہنا مشکل کیوں ہے اور یہ حضرات انگریزی عملداری کو اپنے لیے رحمت اور دارالامن سمجھنے اور لکھنے پر کیوں مجبور ہیں؟ کہیں یہ سب کچھ برٹش گورنمنٹ ہی کے دم قدم کی بہار تو نہیں ہے؟ اِس کے باوجود اسلام کے ٹھیکیدار بننا، اپنے لیے موحد ہونے کا دعویٰ کرنا اور سچے مسلمانوں کو مشرک، بدعتی اور بریلوی فرقہ گننا، یہ کیا ستم ہے؟

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زُہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

موصوف نے وہابیانِ ہند کا برٹش گورنمنٹ کے متعلق نظریہ اور ان کی انگریز دوستی کو واضح لفظوں میں بیان کرتے ہوئے اِس امر کی کوشش کی ہے کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لینے کی وہابیوں پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ نِری الزام تراشی ہے۔ موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"وہابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو اور اُس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اُس کو یہ کہنا کہ در پردہ تخریب سلطنت کی فکر میں چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے، محض تہمت ہے اور ہم اِس وقت بہت سے ایسے آدمی نشان دے

سکتے ہیں، جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ ان سے زیادہ سرکار کا خیر خواہ اور معتمد کوئی نہیں، بایں ہمہ وہ اپنے تئیں علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر وہابی کہتے ہیں۔ سرکار نے بے سوچے سمجھے ان کو معتمد نہیں گردانا۔ بلکہ غدر کے زمانے میں جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی، اُن کی وفاداری کا سونا اچھی طرح تایا گیا اور وہ خیر خواہیِ سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وہ جہاد کا وعظ کہتے ہوتے اور بغاوت وہابیت کی اصل ہوتی تو جو کچھ اُن سے ظہور میں آیا، یہ کیونکر ظہور میں آتا؟"

(الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۲۴۳)

شاید اکبرالٰہ آبادی نے اسی روش کو دیکھ کر یہ شعر فٹ کیا تھا:

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے، جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

سر سید احمد خاں صاحب پر حکومت کو بڑا اعتماد تھا، بڑے سے بڑا انگریز انھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا، کسی وقت بھی ان کی جعفر بنگال اور صادقِ دکن سے کم عزت نہیں کی جاتی تھی۔ اس کامیابی اور اثر ورسوخ کو کس طرح حاصل کیا گیا تھا؟ موصوف کے سوانح نگار خواجہ الطاف حسین حالی کی زبانی سنیے:

"لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسیّد کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا، تو بھی اصل سبب ان کی راست

بازی اور سچائی ٹھیرے گی، کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک
نیٹو (NATIVE) کا اس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا،
جب تک اُس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی
آگ پر تایا نہ گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں۔"

(الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۶۶۳)

سرسید احمد خاں صاحب لندن گئے۔ کس کس سے ملے اور کون کون سی ہستیاں ان سے
آکر ملیں، ملاحظہ فرمایئے:

" الغرض سرسید بمبئے سے چوبیس دن میں لندن پہنچے اور
میکلن برگ اسکوائر میں ایک مکان کرایے پر لے کر
ٹھیرے اور اپنے دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ
لارنس سب سے زیادہ مہربانی، مروّت اور خُلق سے اُن کے
ساتھ پیش آئے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور ان کے
خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی خدمات سے
آگاہ تھے۔ لندن میں وہ (لارڈ لارنس) اکثر اُن (سرسید)
کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ ان
سے ملنے کو آتے تھے۔ انھوں نے ہی سرسیّد کو لندن کے اکثر
امراٗ و مشاہیر سے ملوایا تھا۔ لارڈ اسٹینلی آف ایلڈرلی جو
قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے، وہ بھی جب
لندن میں آتے تھے تو سرسیّد سے ملتے رہتے تھے۔ سرجان

ولیم کے انڈر سیکرٹری وزیرِ ہند کے ساتھ بھی سرسیّد کو خصوصیت ہوگئی تھی ملکۂ معظّمہ کے سمدھی ڈیوک آف آر گائل جو اُس وقت وزیرِ ہند تھے اور سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کے پیٹرن بھی تھے، وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک سے ملتے رہتے اور اپنے بیٹے مارکوئس آف لارن سے بھی، جو ملکہ معظّمہ کے داماد ہیں، اُن کو ملایا۔"

(ایضاً ص۲۰۶)

اسی دورۂ لندن کے مزید حالات وکمالات ملاحظہ ہوں:

"سرسیّد نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز ان کاموں میں، جن کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا، مصروف رہے، بایں ہمہ اِن کو اکثر خاص خاص تقریبوں میں بُلایا جاتا تھا اور ان کی عزّت افزائی کی جاتی تھی۔ ۲۳ جون ۱۸۶۹ء کو وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے اور ۱۳ جولائی کو سمٹونین سوسائٹی آف سول انجینئرس کے ایک عظیم الشان جلسے میں اور اِس کے بعد جو اُسی کے متعلق گرینچ میں ڈنر ہوا، اُس میں شریک ہوئے۔ اِس جلسے کی کیفیت ڈیلی نیوز (DAILY NEWS) مورخہ ۲۱ جولائی میں مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ

مسٹر پن نے جو سوسائٹی مذکور کے پریسیڈنٹ تھے سر سیّد کو اُس جلسے میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقتِ معین پر میرے اسٹیمر میں، جو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے موجود ہوگا، آئیں، مگر خود لارڈ لارنس سر سیّد کے مکان پر آئے اور اُن کو اپنے ساتھ سوار کرا کے لے گئے۔ سیّد حامد اور سیّد محمود بھی ساتھ تھے۔ اسٹیمر میں جا کر حاضری کھائی اور اسٹیمر کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے، پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اُس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گرینچ میں جا کر ڈنر کھایا۔ اِس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجینئر شریک ہوئے۔ کھانے میں طرفہ بات کہ ڈنر مذکور کی مینیو میں مندرج ہے، یہ تھی کہ تیس طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے (وہ دریائی جانور حلال ہیں یا حرام؟) خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی۔ تمام انجینئروں نے جو اِس جلسے میں شریک تھے، کھانے کے بعد اسپیچیں دیں، اور سال گزشتہ کی مختلف ترقیات کا جو انجینئرنگ میں ہوئیں ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے اسپیچ دی اور

آخر میں لارڈ لارنس اور سرسیّد کا ذکر کر کے اُن کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔"

(الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ص ۲۰۷)

گردن ریفارمر کی ہر اک سمت تن گئی
بگڑی ہے قوم وملک کی، ان کی تو بَن گئی

سرسیّد انگریزوں کی نظر میں کیا تھے۔ یہ قارئین نے ملاحظہ فرما لیا کہ صرف برٹش گورنمنٹ ہند کے اراکین وعمائد ہی انھیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ حکومتِ برطانیہ کی عظیم ہستیاں بھی انھیں سرآنکھوں پر بٹھاتی تھیں، آخر کیوں؟ اِس سوال کا جواب خود تلاش کریں۔

اس ضمن میں احقر اتنا عرض ضرور کرے گا کہ غلام ہزار دفعہ یہ کہے کہ میں اپنے آقا کا دل وجان سے خیر خواہ اور وفادار ہوں اور اپنے قول کی عملاً ساری عمر تصدیق بھی کرتا رہے، یہ اس کی انتہائی فرماں برداری اور نمک حلال غلام ہونے کی دلیل ضرور ہے لیکن اگر آقا اپنے غلام کی اطاعت شعاری، فرماں برداری و جاں نثاری کا اعتراف کرے، خود اُس غلام کی ثنا خوانی کرنے لگ جائے تو یہ اس کی سب سے بڑی اطاعت شعاری کی دلیل ہی نہیں بلکہ فرمانبرداری کے نام پر پرستش کی حدود تک یہ جذبۂ عقیدت ووابستگی، اُسے لے گیا ہوتا ہے۔ موصوف کے بارے میں ایک بیان ایسا بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ سپیشل کمشنر اور جج، مسٹر کری کرافٹ ویسن نے سر سیّد احمد خاں صاحب کے کارناموں کے پیشِ نظر شہر میرٹھ (یو۔ پی) میں موصوف کو مخاطب کر کے واشگاف الفاظ میں علیٰ رؤس الاشہاد کہا تھا:

"تم (سرسید) ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت
(۱۸۵۷ء) میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا۔۔۔۔
سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال
اعتماد کے ساتھ ضلع بجنور کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی
طرح نمک حلال اور وفادار سرکار کے رہے۔ اِس کے صلے
میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور
تمہاری اولاد کی عزّت اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم
ہے۔" (حالی پانی پتی: حیات جاوید، ص ۱۳۳)

؎ بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں
ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارک باد دوں

۱۵۔ علامہ شبلی نعمانی

شبلی نعمانی (التوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) سولہ سال علی گڑھ کالج میں رہے۔ ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں موصوف کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ان کے متعلق شیخ محمد اکرام کی یہ تصریح موصوف کو سمجھنے میں کافی حد تک مددگار ثابت ہوگی:

"شبلی قریباً سولہ سال علی گڑھ میں ملازم رہے۔ یہیں انھوں

نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور مستشرقین کی کتابوں تک رسائی حاصل کی اور یہیں سرسید کی با اثر شخصیت نے ان کی قلبِ ماہیت کی۔ بقول مولانا مہدی حسن، شبلی نے مولویت علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑ دی۔ اُن کے خیالات کی کایا پلٹ، مذاقِ تصنیف اور وسیع النظری، غرض یہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامنِ تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اُس پر دیباچہ لکھا، وہ آج بھی اُن کی ادبی شرافت کا پتہ دیتا ہے۔"

(محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، مطبوعہ لاہور، بارِ ہشتم ۱۹۶۸ء، ص ۲۲۱، ۲۲۲)

برٹش گورنمنٹ کے بارے میں شبلی نعمانی کے نظریات کیا تھے، موصوف کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

"میں (شبلی) مدّت العمر کبھی انگریز گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے (یعنی ہندوستان کے رہنے والوں اور انگریزوں کی طرف سے) جو غلط فہمیاں مدّتِ دراز سے چلی آتی ہیں، دور ہوں۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں، میں نے "الندوہ" میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں

پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً فرض ہے۔"

(محمد اکرام شیخ: شبلی نامہ، ص ۲۴۵)

شبلی نعمانی نے اپنی وفات سے پہلے ایک طویل عرضداشت، عبدالماجد دریابادی سے لکھوا کر حکومت صوبجات متحدہ آگرہ واؤدھ (یو۔پی) کے چیف سیکرٹری کی خدمت میں پیش کی تھی، مذکورہ بالا عبارت اسی عرض داشت کا ایک اقتباس ہے۔شیخ محمد اکرام صاحب نے شبلی نامہ کے علاوہ اپنی مشہور و معروف تصنیف "موجِ کوثر" میں بھی یہ اقتباس نقل کیا ہے،لیکن موجِ کوثر میں اِس عبارت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

"اور اسی سال (۱۹۰۸ء) ندوہ کے سالانہ جلسے میں وفاداری کا (برٹش گورنمنٹ کے وفادار رہنے کا) ایک ریزولیشن بھی پاس کروایا، پھر معاملۂ مولوی عبدالکریم میں، محض اِس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ (برٹش گورنمنٹ کے خلاف) مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں گالیاں سُننا پڑیں۔"

(محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۲۲۴)

۱۶۔ الطاف حسین حالی

موصوف ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلّہ انصاریاں میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازمت مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء میں ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کو

پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اِس کے بعد پنجاب کے لیفٹنٹ گورنر کے میر منشی یعنی پیارے لال آشوب کی سفارش پر " گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو" لاہور میں مترجمہ کتابوں کی اردو عبارت درست کرنے کے لیے ملازم رکھ لیے گئے۔اس کے بعد کچھ عرصہ "اینگلو عربک سکول دہلی "میں بھی ملازمت کی۔۱۸۸۸ء سے سرسید احمد خاں کی سفارش پر پچھتر روپے ماہوار وظیفہ ملنا شروع ہوگیا، جو بعد میں سو روپے ماہوار کردیا تھا۔۱۹۰۲ء میں گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب بخش دیا۔۱۹۱۴ء میں موصوف کا انتقال ہوا۔

موصوف بھی نیچریت کے حامی اور سرسید احمد خاں کی برطانوی گاڑی کو ہانکنے میں مددگار تھے ۔ اپنی شاعری کے ذریعے نیچری مذہب کو پھیلانے، مسلمانانِ ہند کو گورنمنٹ برطانیہ کا وفادار اور بندۂ بے دام و ثنا خواں بنانے میں پورا زور لگاتے رہے۔انگریز قوم اور مغربی تعلیم وتہذیب کی صفت وثنا بیان کرتے ہوئے موصوف کی عمر دراز بھی انتہائی مختصر ثابت ہوئی ورنہ شاید معاملہ کہاں سے کہاں جا پہنچتا۔سرسیّد احمد خاں کے حکم سے آپ نے ایک معرکے کی نظم لکھی جو "مسدس حالی "کے نام سے مشہور اور اِن کے مرشد جسے سرمایۂ افتخار شمار کیا کرتے تھے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے اس مسدس میں انگریزوں کو نوعِ انسان سے نرالی مخلوق، دیوتا، معجز نما ہستیاں، مالکِ خزائن، غیب دان اور بہت کچھ مانا اور دوسروں کو ایسا ہی ماننے کی یوں ترغیب دی ہے:

جنھوں نے بنایا اسے اپنا یاور
ہراک راہ میں اس کو ٹھہرایا رہبر
یہ قول آجکل صادق آتا ہے ان پر
کہ اک نوع ہے نوعِ انساں سے بہتر
الگ سب سے کام ان کے اور طور ہیں کچھ
اگر سب ہیں انساں، تو وہ اور ہیں کچھ

بہت ان کو معجز نما جانتے ہیں
بہت دیوتا ان کو گردانتے ہیں
یہ جو ٹھیک ان کو پہچانتے ہیں
وہ اتنا مقرر نہیں مانتے ہیں
کہ دنیا نے جو کی تھی اب تک کمائی
وہ سب جزو و کُل ان کے حصہ میں آئی

کیا علم نے اُن کو ہر فن میں یکتا
نہ ہمسر رہا کوئی ان کا نہ ہمتا
ہر اک چیز ان کی، ہر اک کام اُن کا
سمجھ بوجھ سے ہے زمانہ کی بالا

صنائع کو سب ان کے تکتے ہیں ایسے
عجائب میں قدرت کے حیراں ہوں جیسے

دِیے علم نے کھول اُن پر خزانے
چھپے اور ظاہر، نئے اور پُرانے
دکھائے انھیں غیب کے کل خزانے
بتائے فتوحات کے سب ٹھکانے
ہوا جیسے چھائی ہے سب بحرو بر پر
وہ یوں چھاگئے خیبر و باختر پر

(الطاف حسین حالی: مسدس حالی، مطبوعہ لاہور، ص۸۹،۹۰ ؎)

انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی، ان کے دین میں تخریب کاری کی، ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، دولت و عزت سب کچھ ان سے چھین لیا اور ہزاروں مکروزور اور جبر و استبداد سے انھیں اپنا غلام بنالیا۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کس طرح ان غیر ملکی ڈاکوؤں کی غلامی کا جنؤا اتار کر پھینک دیں، آزادی کی فضا میں سانس لیں اور جلد از جلد غلامی کی لعنت سے نجات حاصل کرلیں۔لیکن انگریزوں کے زرخرید حضرات مسلمانوں کو یہی تبلیغ کیا کرتے تھے کہ یہ عملداری تو ہماری اپنی عملداری ہے، ہم غلام کہاں ہیں؟ ہمیں تو ہر قسم کی آزادی ملی ہوئی ہے، ہمیں ہر طرح کا آرام نصیب ہے اور ہمیں ترقی کرنے کے حکومت نے پورے پورے مواقع فراہم کیے ہوئے ہیں، لہٰذا خاموشی اور شکر گزاری کے ساتھ ان

مراعات سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور گورنمنٹ کی بدخواہی کا دل میں خیال بھی نہیں لانا چاہیے۔حالی نے بھی یوں تلقین کی ہے:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں
ترقی کی راہیں سرا سر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں
کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی
نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی
نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑاکے سے دو مسجدوں میں

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں
نہیں بند صنعت کی، حرفت کی راہیں

جو روشن ہیں تحصیلِ حکمت کی راہیں
تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور نہ دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں
گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں
شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا

پہنچتی ہیں ملکوں میں دم دم کی خبریں
چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں ہیں ہر اک برِّ اعظم کی خبریں
کھلی ہیں زمانہ پہ عالم کی خبریں
نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا

کرو قدر اس امن و آزادگی کی
کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
ہر اک راہ رُو کا زمانہ ہے ساتھی
یہ ہر سو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خبر ہے

(الطاف حسین حالی: مسدس، مطبوعہ لاہور، ص ٦٦، ٦٧)

مسلمانوں کو از روئے احادیث کفار کے تشبہ سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اسلامی غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے روش پر پکے رہیں اور خدا کے دشمنوں کے کسی طرح بھی مشابہ ہونے کی کوشش نہ کریں۔ انگریز دوستی میں اِس ممانعت کا شاعر نیچریت اور قوم کی غمخواری کا دم بھرنے والے نے یوں مذاق اڑایا ہے:

ہمیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے
کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی ہے
مخالفت کی ریس اس میں کرنی بری ہے
نشاں غیرتِ دینِ حق کا یہی ہے
نہ ٹھیک ان کی ہرگز کوئی بات سمجھو
وہ دن کو کہیں دن تو تم رات سمجھو

قدم گر رہِ راست پر ان کا پاؤ

تو تم سیدھے رستہ سے کترا کے جاؤ
پڑیں اُس میں جو دقتیں وہ اُٹھاؤ
لگیں ٹھوکریں جس قدر اس میں کھاؤ
جو نکلے جہاز اُن کا بچ کر بھنور سے
تو تم ڈال دو ناؤ اندر بھنور کے

اگر مسخ ہوجائے صورت تمہاری
بہائم میں مل جائے سیرت تمہاری
بدل جائے بالکل طبیعت تمہاری
سراسر بگڑ جائے حالت تمہاری
تو سمجھو کہ ہے حق کی اک شان یہ بھی
ہے اک جلوۂ نورِ ایمان یہ بھی

نہ اوضاع میں تم سے نسبت کسی کو
نہ اخلاق میں تم سے سبقت کسی کو
نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو
نہ پیدا یہ پوشش نہ زینت کسی کو
تمھیں فضل ہر علم میں برملا ہے

تمھاری جہالت میں بھی اِک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بری تم
رہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم
حمایت میں ہو جبکہ اسلام کی تم
تو ہو ہر بدی اور گز سے بری تم
بدی اور گنہ سے نہیں مومنوں کو مضرّت
تمھارے گناہ اور اوروں کی طاعت

مخالف کا اپنے اگر نام لیجے
تو ذکر اس کا ذلت سے خواری سے کیجئے
کبھی بھول کر طرح اُس کو نہ دیجئے
قیامت کو دیکھو گے اِس کے نتیجے
گناہوں سے ہوتے ہو گویا مُبرّا
مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرّا

(الطاف حسین حالی : مسدّس ، مطبوعہ لاہور، ص ۵۱،۵۲)

سائنس کی افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے لیکن حقیقی علم اِسی کو ٹھہرانا اور اسے سرمایۂ فخرِ انسان بتانا، اُن حضرات کا کام تو ہوسکتا ہے جنھیں آخرت پر یقین ہی نہ ہو یا جو آخرت کی حقیقی زندگی پر اس چند روزہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دینا ہی بہتر سمجھتے ہوں۔ سائنس

کے بارے میں موصوف کے نظریات ملاحظہ ہوں:

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب یاں
کہ ہے علمِ سرمایۂ فخرِ انساں
عرب اور عجم، ہند اور مصر و یوناں
رہا اتفاق اس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا اک جس پہ حجت نہ تھی کچھ
کھلی اس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ

جواہر تھے اک سب کی نظروں میں بھاری
پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری
نہ تھیں طاقتیں اس کی معلوم ساری
یہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ تھا علم میں زورِ دستِ الٰہی

کیا کوہساروں کو مسمار اس نے
بنایا سمندر کو بازار اِس نے
زمینوں کو منوایا دوّار اِس نے

ثوابت کو ٹھہرایا سیار اس نے
لیا بھاپ سے کام لشکر کشی کا
دیا پتلوں کو سکت آدمی کا

یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا
جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا
صداؤں کو سانچے میں ڈھلوانے والا
زمین کے خزانے اگلوانے والا
یہی برق کو نامہ بر ہے بناتا
یہی آدمی کو ہے بے پر اُڑاتا

تمدن کے ایواں کا معمار ہے یہ
ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ
کہیں دستکاروں کا اوزار ہے یہ
کہیں جنگجویوں کا ہتھیار ہے یہ
دکھایا ہے نیچا دلیروں کو اِس نے
بنایا ہے روباہ شیروں کو اِس نے

اِسی کی ہے اب چار سو حکمرانی
کیے اس نے زیر ارمنی اور یمانی
ہوئے رام دیوان ماژندرانی
گئے زابلی بھول سب پہلوانی
ہوا اس کی طاقت سے تسخیر عالم
پڑے سامنے اس کے چرکس نے ویلم

(الطاف حسین حالی، مسدس، مطبوعہ لاہور، ص۸۸،۸۹)

حالی صاحب انگریزوں پر ایسے ایمان لائے تھے کہ ان کی ہر چیز سے پیار اور والہانہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ موصوف کے نزدیک مغربی علوم وفنون ہی حق کا جلوہ ہیں، گویا دوسرے باطل کا اندھیرا ہوئے، چنانچہ فرماتے ہیں:

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے
وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے
کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
جمی ہیں دلوں میں ارسطو کی رائیں
جو اب وحی اُترے تو ایماں نہ لائیں

(ایضاً:ص۵۷)

۱۷۔ مولوی رشید احمد گنگوہی

آپ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مدرسہ دیو بند کے سرپرستوں اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں سے تھے۔ وہابیوں کی جماعت میں سے جب شاہ محمد اسحاق دہلوی خلیفہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے گول مول اور مخصوص خیالات سے اتفاق رکھنے والوں کی جماعت بنی اور دیو بندی مکتب فکر کے نام سے روشناس ہوئی، تو اُس قافلے کے مولوی رشید احمد گنگوہی ہی قافلہ سالار قرار پائے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دیگر نامور خلفاء نے گنگوہی صاحب اور ان کے ہم خیال علمائے دیو بند کا تعاقب کیا کہ یہ حضرات اپنے اکابر اور پیر و مرشد کے طریقے کے خلاف جارہے تھے۔ جب اس قضیہ کی خبر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو ملی تو اپنے متعلقین کو سمجھانے کی غرض سے، جن مسائل میں ان حضرات کا نزاع تھا، ان کے بارے میں اپنے نظریات و معمولات لکھ کر، ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' کے نام سے موصوف کے پاس اس کی کاپیاں بھیج دیں۔ گنگوہی صاحب نے اپنے پیر کے فیصلے کی یہ قدر کی کہ اپنے ایک شاگرد (خواجہ حسن نظامی دہلوی) کو ان تمام کاپیوں کو جلانے کا حکم صادر فرما دیا۔

فقہ حنفی کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود موصوف نے اپنے تحکم سے اِس میں ایسی تراش خراش فرمائی اور خوارِج زمانہ کے نظریات داخل کیے کہ ابنائے زمانہ کو

داغدار ٹھہرانے کی غرض سے امکان کذب کے ناپاک عقیدے کو وقوع کذب تک بڑھا دیا۔ شیطان لعین کو فخرِ دو عالم ﷺ سے بھی اعلم واوسع علماً ٹھہرا دیا اور علمبردارِ خارجیت، امام الوہابیہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کے تمام غیر اسلامی عقائد ونظریات کی کھل کر تصدیق وتائید کرتے رہے۔ اِن کا وصال ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ہوا۔

موصوف نے اپنے اکابر سے رشتہ توڑا، اپنے پیر ومرشد سے تعلق چھوڑا، آخر ایسا کیوں کیا؟ کہیں یہ حکومت کی شہ پر تو ڈرامہ نہ کھیلا گیا ہو، جس کی تخریب کاری کی مشین اندرونِ خانہ بڑی عیاری اور رازداری سے چل رہی تھی، کہیں مولوی ہدایت احمد گنگوہی کے فرزند اور حاجی امداد اللہ تھانوی علیہ الرحمہ کے مرید، مولوی رشید احمد گنگوہی ساحرینِ برطانیہ کے جادو کا شکار تو نہیں ہو گئے تھے۔ آیئے واقعات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی شروع ہو چکی ہے۔ موصوف کے ہم خیال علماء نے اپنا ایک جتھا منظم کر لیا ہے۔ ہتھیار لگا کر باہر پھرتے ہیں۔ کس سے لڑنے کے لیے پھرتے تھے؟ ہمیں کیا معلوم جبکہ قریباً سوا سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آیئے موصوف کے سوانح نگار، اُن کے عاشقِ زار، مولوی عاشق الٰہی میرٹھی سے پوچھتے ہیں:

> "ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (مولوی محمد قاسم نانوتوی) اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے اور

بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے
مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے والا یا ہٹ جانے
والا نہ تھا، اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور
سرکار پر جانثاری کے لیے تیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت و
جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر
سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں
تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے
گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ (گنگوہی
صاحب) پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب
رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔"

(عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء ص ۷۴)

اب معلوم ہوگیا۔ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے راز بتا دیا کہ گنگوہی صاحب نے اپنے اکابر اور اپنے پیر سے قلبی رشتہ کیوں توڑ لیا تھا؟ اس لیے کہ برٹش گورنمنٹ سے جانثاری و وفاداری کا عہد و پیمان جوڑا گیا تھا۔ یہ بات بالکل صاف اور سیدھی سادی ہے، جس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں، ادھوری عبارت یا سیاق و سباق سے توڑنے مروڑنے کی تہمت نہیں، خود گنگوہی صاحب کے سوانح نگار اور نامور دیوبندی عالم کی شہادت ہے، مخالفانہ بیان بھی اسے نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ یہ بیان دینے والا عالم اہلسنت نہیں۔ یہ ناچیز اِس امر کے فیصلے کا حق قارئین کے سپرد کرتا ہے کہ مذکورہ

حوالے کی روشنی میں مولوی رشید احمد گنگوہی انگریزوں کے مخالف ثابت ہوتے ہیں یا برٹش گورنمنٹ کے دل و جان سے وفادار بلکہ جانثار نظر آرہے ہیں؟

پروفیسر محمد ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند اردو مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۵۷۰ پر بلکہ متعدد کتب و رسائل میں اور ان کی دیکھا دیکھی موجودہ علمائے دیوبند نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ نے ۱۸۵۷ء میں شاملی کے مقام پر انگریزوں سے لڑائی لڑی تھی، لہٰذا اکابرِ علمائے دیوبند مجاہدینِ جنگِ آزادی اور انگریزوں کے مخالف ہیں۔ یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تو علمائے دیوبند ماسوائے گاندھوی علماء کے باقی سب انگریزوں کے نہ صرف خیر خواہ و وفادار بن کر رہے بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کار بن کر ملّتِ اسلامیہ سے کٹ کر ایک نئے فرقے کا اضافہ اور کر بیٹھے نیز اسلامی عقائد میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی پیوند کاری کرتے رہے۔ اگر یہ حضرات انگریزوں کے آلۂ کار نہ بن گئے ہوتے تو یہ سوادِ اعظم اہلسنت و جماعت سے کٹ کر اپنا فرقہ الگ کیوں بناتے نیز اہلسنت و جماعت کے متوارث مذہب کا اپریشن کیوں کرتے؟ لیکن اُدھر انگریز بستر گول کر کے راہیِ برطانیہ ہوئے اِدھر نوّے سال بعد ان حضرات نے اپنے اکابر کی تاریخ کو بدلتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے رشید احمد گنگوہی اور محمد قاسم نانوتوی وغیرہ بزرگ تو انگریزوں کے مخالف اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو تھے۔ تاریخ کا اِس طرح مذاق اڑا کر اُسے بازیچۂ اطفال بناتے اور حقیقت کا منہ چڑاتے وقت اگر دیوبندی علماء و مورخین کو خوفِ خدا یاد نہیں رہتا تو ایسا کرتے وقت کیا ان حضرات کو

بندگانِ خدا سے بھی کوئی شرم و عار محسوس نہیں ہوتی ؟ کیا ان حضرات کی غلط بیانی سے حقیقت بدل جائے گی؟ کیا اس قسم کی حرکتیں ہی ان حضرات کا طرۂ امتیاز ہیں؟

تذکرۃ الرشید کے محولہ بالا حوالے کو موجودہ دیوبندی عالم، مفتی عزیز الرحمن بجنوری نے یوں بیان کیا ہے:

"جب پلٹن (انگریزی فوج) مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یک دم فیر (فائر) کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں، جو یہاں چھپے ہوئے ہیں، توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے ان حضرات کی ـ ـ ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا، ضلع سہارن پور سے متعلق تھا، وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اِس پر حملہ کیا جائے، چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی، مغلوب ہوگئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکہ میں شہید ہوگئے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔"

(عزیز الرحمن بجنوری: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۸۰)

گویا واقعہ سب کے نزدیک وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوّے سال تک یہ لڑائی حکومت کے مخالفین یعنی حریت پسندوں کے ساتھ بتائی جاتی رہی اور انگریز چلے گئے تو یہی لڑائی انگریزوں کے خلاف بتانی شروع کر دی۔ اگر ہم موجودہ حضرات کے موقف کو درست تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی یہ فیصلہ غلط ہی رہے گا، کیوں کہ بعد کے واقعات اس موقف کی تائید کرنے سے یکسر مجبور ہیں۔ جب لڑائی کی آگ ٹھنڈی ہوئی، انگریز دوبارہ قابض و مسلط ہو گئے تو دار و گیر کا دور شروع ہو گیا۔

اِس دور میں، خصوصاً مسلمانوں پر کیا قیامت ڈھائی گئی، اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے اسی کتاب کے پہلے باب میں اس قیامت خیز منظر کی جھلک قارئین کرام دیکھ چکے ہیں۔ ذرا سا شبہ سولی پر لٹکانے کے لیے کافی تھا، کسی انگریز کی اگر مدد نہ کرنے کا الزام عائد ہوا تب بھی دار پر کھینچ دینے سے کم سزا نہ تھی، کسی انگریز کی تعظیم نہ بجالائے یا کھڑے ہو کر عاجزانہ سلام نہ کیا تو گولی کا نشانہ بنائے گئے۔ جن بستیوں کے چند افراد نے بھی انگریزوں سے لڑائی کی، اِس انتقامی دور میں ان بستیوں کو سرے سے صاف ہی کر دیا گیا۔ اگر واقعی یہ علمائے دیوبند انگریزوں سے لڑے تھے تو سولی یا سزائے موت سے کم کے بغیر تو نہیں رہ سکتے تھے، لیکن بعد کے واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ ان حضرات میں سے کسی ایک کے پیر میں کانٹا تک بھی نہیں چبھویا گیا۔ اگر انگریزوں سے لڑے تھے تو انھیں کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ آیئے موصوف کے سوانح نگار مولوی عاشق الٰہی میرٹھی سے مزید معلومات حاصل کرتے ہیں:

"شروع ۱۲۷۶ھ نبوی/۱۸۷۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی) قدس سرّہٗ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا۔[1]

(عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۳)

اسی بات کو دوسری جگہ ذرا تفصیل سی موصوف نے یوں بیان کیا ہے:

"جب بغاوت وفساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اِس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیرخواہ اپنے کو ظاہر کریں، انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات (گنگوہی و نانوتوی صاحبان) پر بغاوت کا الزام لگایا۔"

(عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۷۶)

مولوی رشید احمد گنگوہی کے رفیق جانی اور مدرسہ دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں مندرجہ ذیل پرلطف حکایت کا پیش کرنا، شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ ہر عقلمند کو دعوتِ غور وفکر دے رہی ہے:

"جب مجاہد علماء کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو آپ (مولوی محمد قاسم نانوتوی) کی گرفتاری کے بھی وارنٹ جاری ہوئے۔

خدام اور متوسلین کے بہت زیادہ اصرار پر آپ ایک مکان
میں رُوپوش ہوئے اور تین دن کے بعد پھر کھلے بندوں چلنے
پھرنے لگے۔ لوگوں نے پھر رُوپوشی کے لیے بمنت عرض کیا
تو آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش
ہونا سنت سے ثابت نہیں جناب رسول اللہ ﷺ ہجرت کے
وقت غارِ ثور میں تین دِن ہی روپوش رہے ہیں۔"

(مناظر احسن گیلانی، مولوی: سوانح قاسمی، جلد دوم، ص ۱۷۳)

اتباعِ سنت کی حقیقت تو خانقاہِ گنگوہ سے لے کر انکارِ خاتمیت زمانی تک معلوم ہے۔ اُمتِ محمدیہ کے مسلّمہ عقیدۂ ختمِ نبوت کا انکار کر کے ایک ایسی خاتمیت گھڑنے والے بھی تو یہی نانوتوی صاحب ہیں، جس کا نام سننے سے بھی تیرہ سو سال کے مسلمانوں کے کان نا آشنا رہے۔ کیا یہ کارنامہ بھی اتباعِ سنت میں دکھایا تھا؟ بہرحال اِس سے قطع نظر، مولوی محمد قاسم نانوتوی کی جوانمردی و دلیری ہے کہ تین دن روپوش رہنے کے بعد دندناتے پھرنے لگے اور اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز یہ ادا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مولوی رشید احمد گنگوہی پر اپنی رحمدل سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ دیوبندی علماء و مورخین تو ان حضرات کو مجاہد بنا کر، الزام کا رونا رو کر، پھر قید و بند سے چھڑا کر مطمئن ہو گئے ہوں گے اور ان بانکے مجاہدوں کے معرکوں پر ڈینگیں مارنے لگے ہوں گے لیکن ہم ان حضرات سے اتنا ضرور دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جناب والا! آپ کے ان مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف شاملی کی لڑائی

لڑی، انگریزی پلٹن سے توپ خانہ بھی چھین لیا، چلیے یوں ہی سہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِن حضرات پر بدخواہوں نے ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی تہمت لگا کر گرفتار کروا دیا، بھلا اب مجاہد ہونے اور انگریز دشمن کہلانے میں، کون ہے جو ان حضرات کے متعلق شک کر سکے گا؟ لیکن اتنا تو ازراہِ کرم بتا دیجیے کہ آپ کے یہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد، حریت پسند جنگِ آزادی کے ہیرو، ۱۸۵۷ء سے آخر وقت تک انگریزوں کی نگاہوں میں کیا بن کر رہے تھے؟ دوست سمجھے گئے یا دشمن، مخالف گردانا گیا یا آلۂ کار، سالہا سال تک انگریزوں نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ اے شاملی کے مقام پر ہم سے لڑنے والو! اے ہمارا توپ خانہ تک چھین لینے والو! ہم سے لڑے کیوں تھے؟ ہمارا توپ خانہ کیوں چھینا تھا؟ کیا برٹش گورنمنٹ ان چند علمائے دیوبند سے اتنی خائف و ہراساں اور لرزاں و ترساں تھی کہ سزا دینا تو بہت بڑی بات ہے، ان سے اپنا توپ خانہ واپس لینے کی اپیل یا عرض بھی ان کی خدمت میں نہ کر سکی؟ آخر رکاوٹ کیا تھی؟

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ ادا سے ہم

ہزار چک پھیریوں سے اپنے اکابر کو مجاہد اور انگریز دشمن ثابت کرنے کی کوششیں کرتے ہیں لیکن تیلی کے بیل کی طرح جہاں سے چلتے ہیں پھر وہیں آ پہنچتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھ بیٹھتے ہیں کہ ساری کاوشوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ مولوی عزیز الرحمٰن بجنوری کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے:

" حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام ربانی

(مولوی رشید احمد گنگوہی) اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔۔۔آپ (گنگوہی صاحب) اپنی دادھیال رامپور تشریف لے گئے لیکن مخبر کی خبر رسانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔ یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارن پور جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی، مقدمہ چلتا رہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ آپ نے تسبیح دکھلا کر فرمایا، "ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے"۔ سہارن پور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کیا گیا۔ بالآخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا رہا کر دیا۔"

(عزیز الرحمن بجنوری، مولوی: تذکرہ مشائخ دیو بند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء ص ۱۱۷)

باقی باتوں سے قطع نظر جب برٹش گورنمنٹ کو سعی بسیار کے باجود اس امر کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی نہ مل سکا کہ مولوی رشید احمد گنگوہی حکومت کے بدخواہ ہیں یا ۱۸۵۷ء میں انھوں نے انگریزوں کے مفادات کے خلاف کوئی ادنیٰ سی حرکت بھی کی تھی۔ تو موجودہ حضرات کو کون سے دلائل یا حقائق وشواہد کا کھوج مل گیا ہے جن کی بنا پر بلند بانگ دعاوی کر کے اپنی سابقہ تاریخ کو بدلنے کی جسارت کرتے اور اسی کو

حقیقت منوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ کم از کم ان حضرات کو اپنے بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے اور اپنے اکابر کو اپنی رحم دل گورنمنٹ کے باغیوں اور مفسدوں کی فہرست میں تو شامل نہ کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو برٹش گورنمنٹ کیا تھی:

"جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انھوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔"

(عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۴)

اپنے اکابر مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ کی موصوف نے یوں صفائی پیش کی ہے:

"جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے۔ تا زیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔" (ایضا: ص ۷۹)

موصوف برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ تھے یا مفسدوں اور باغیوں میں شریک رہے تھے، اس امر کا فیصلہ تو قارئین کرام خود کریں گے۔ راقم الحروف تو اس سے آگے صرف یہی کر سکتا ہے کہ جملہ متبعین کے بیانات سے قطع نظر کر کے، خود عالیجناب معلیٰ القاب، مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کا ایک ذاتی بیان نقل کر دیتا ہے کہ موصوف کا خود اپنے بارے میں اپنا فیصلہ کیا ہے؟

"میں جب (مولوی رشید احمد گنگوہی) حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ

ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اُسے اختیار ہے،
جو چاہے کرے۔"

(عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۸۰)

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

ہوسکتا ہے کسی صاحب کو یہ شبہ لاحق ہو جائے کہ "تذکرۃ الرشید" کتاب تاریخی لحاظ سے نا قابلِ اعتبار ہو یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک اس کے مندرجات مسلّمہ نہ ہوں یا اسے تاریخی لحاظ سے کوئی اہمیت حاصل نہ ہو، لہٰذا ہم اس کتاب پر ان حضرات کے مایۂ ناز مورّخوں کی مہر تصدیق ثبت کروادیتے ہیں، عبدالرشید ارشد فرماتے ہیں:

"میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہر کے بار بار کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے ہیں کہ "تذکرۃ الرشید بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے۔ میں (غلام رسول مہر) نے سالک صاحب (عبدالمجید سالک) اور اپنے کئی دوسرے احباب کو یہ کتاب پڑھائی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنگوہی کی عظمت دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔"

(عبدالرشید ارشد: بیس ۲۰ بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۲ حاشیہ)

۱۸۔ مولوی اشرف علی تھانوی

موصوف کی پیدائش ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء کو تھانہ بھون میں ہوئی۔ مولوی محمود الحسن دیو بندی کے خاص الخاص تلامذہ میں سے ہیں۔ مدرسہ دیوبند کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔ اپنی جماعت کی گاندھویت میں ہمنوائی کرنے سے الگ رہے۔ دیوبندی حضرات انھیں حکیم الامت اور مجدد ملت کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ موصوف نے اپنی مشہور تصنیف "بہشتی زیور" کے پہلے حصے میں ان امور کی ایک فہرست پیش کی ہے جو ان کے نزدیک کفر و شرک ہیں۔ اگر موصوف کی اس فہرست کو سامنے رکھا جائے تو کسی متنفس کو بھی مسلمان ثابت نہ کیا جاسکے گا۔ اس کے علاوہ تھانوی صاحب نے اپنی بعض تصانیف میں چند عبارتیں ایسی بھی درج کی ہیں جن کی ایک مسلمان کہلانے والا ہرگز جرأت اور جسارت نہیں کرسکتا۔ سرورِ کون و مکاں، فخرِ دوعالم ﷺ کی بارگاہ میں ایسے گندے الفاظ لکھنے کی تو اس سرکار کے بدترین دشمنوں اور کھلے کافروں کو بھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ان عبارتوں کا تفصیلی ذکر اپنے موقع و محل پر آئے گا (انشاءاللہ تعالیٰ)۔ موصوف نے ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

یکم محرم ۱۳۶۵ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے مکان پر سیاسی اختلاف کو رفع کرنے موصوف کو اپنا ہم خیال بنانے کی غرض سے سات گاندھوی علماء تشریف فرما ہوئے:

۱۔ مولوی حسین احمد ٹانڈوی صدر جمعیۃ العلمائے ہند

۲۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی سابق صدر جمعیۃ العلمائے ہند
۳۔ مولوی احمد حسین سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند
۴۔ مولوی حفظ الرحمن سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلمائے ہند
۵۔ مولوی عبدالحلیم صدیقی
۶۔ مولوی عبدالحنان
۷۔ مفتی عتیق الرحمن

سوا تین گھنٹے تک ان حضرات کی حالاتِ حاضرہ پر گفتگو رہی۔ اپنا اپنا موقف واضح کیا بعض خفیہ گوشے بھی سامنے آئے، جو مولوی طاہر احمد قاسمی کے قلم سے مولوی شبیر احمد عثمانی کی تصدیق کے ساتھ پیش خدمت ہیں عثمانی صاحب نے فرمایا:

> ''دیکھئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اور آپ کے مسلم بزرگ و پیشوا تھے، ان کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ان کو چھ سو روپیہ ماہوار حکومت کی جانب سے دئے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا علم نہ تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے۔ مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو اس کا شبہ بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اسی طرح اگر حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے مگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اسے استعمال کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً

اس میں ماخوذ نہیں ہوسکتا۔"

(طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶)

ظاہر ہے کہ مولوی اشرف علی تھانوی کے متعلق یہ بیان دینے والے مشہور دیوبندی عالم ہیں اور دوسری طرف سننے والے ایسے سات دیوبندی علماء ہیں، جنھیں اس جماعت کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے، لیکن وہ اس بیان کی تردید میں ایک لفظ بھی اپنی زبانوں پر نہ لا سکے۔

مولوی حسین احمد ٹانڈوی ایک دفعہ حکومت کے زیرِ عتاب آئے، جیل خانے میں رہے بعض لوگوں نے اس واقعے میں تھانوی صاحب کا ہاتھ بتانے کی کوشش کی اور مسلسل کان بھرتے رہے تھے۔ مدتوں بعد موصوف نے اپنے ایک خط میں لکھا:

" مولانا مرحوم (مولوی اشرف علی تھانوی) کے بھائی محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی میں بڑے عہدیدار اخیر تک رہے۔ اُن کا نام مظہر علی ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا ہو مستبعد نہیں۔"

(حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: مکتوباتِ شیخ، جلد دوم، ص ۲۹۷)

یہ بیانات اگرچہ اپنی جگہ پر بالکل واضح ہیں لیکن ہم یہاں مولوی اشرف علی تھانوی کا ذاتی بیان، خود ان کے اپنوں کی مرتبہ کتاب سے پیش کر کے اس سلسلے میں اتمامِ حجت کرنا چاہتے ہیں، بیان ملاحظہ ہو:

" ایک شخص نے مجھ (مولوی اشرف علی تھانوی) سے دریافت کیا تھا کہ اگر تمہاری حکومت ہو جائے تو انگریزوں

کے ساتھ کیا برتاؤ کرو گے؟ میں نے کہا محکوم بنا کر رکھیں گے
کیونکہ جب خدا نے حکومت دی تو محکوم بنا کر ہی رکھیں گے،
مگر ساتھ ہی اِس کے نہایت راحت وآرام سے رکھا جائے
گا، اِس لیے کہ اُنھوں نے ہمیں آرام پہنچایا ہے۔"

(اشرف علی تھانوی، مولوی: الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۶۹۷)

مدّعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

۱۹۔ مولوی شبیر احمد عثمانی و مولوی آزاد سبحانی

مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی بن مولوی فضل الرحمن دیوبندی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے، موصوف کے والد ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ خود موصوف نے مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی اور کچھ عرصہ اس کے صدر بھی رہے۔ جمعیۃ العلمائے ہند کے آپ بھی ایک رکن تھے لیکن کسی وجہ سے آپ اپنے اکابر اور رفقائے کار کی گاندھوی روش کو برداشت نہ کر سکے، اس لیے جمعیۃ العلمائے اسلام کے نام سے اپنی علیحدہ جماعت بنا لی جو دیوبندی طبقے میں بھی نسبتاً اقلیت میں ہی رہی۔ اکثریت میں وہی حضرات تھے جنھوں نے گاندھی کو اپنا بے تاج بادشاہ اور امام و پیشوا بنایا ہوا تھا۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء میں آپ نے وفات پائی۔

چونکہ آپ مطالبۂ پاکستان کے حامی اور مسلم لیگ کے ہمنوا تھے، اس لیے جملہ علماءِ دیوبند، ماسوائے چند کے، آپ سے ناخوش تھے۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کے گزشتہ بیان میں علمائے دیو بند کے جس مذاکرے کا ابھی ذکر کیا تھا، اس میں جمعیۃ العلمائے ہند کے ناظمِ اعلیٰ، مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنے وفد کی طرف سے علامہ عثمانی کی جمعیۃ العلمائے اسلام کے قیام اور اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

> "مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں جمعیۃ العلمائے اسلام حکومت کی مالی امداد اور اس کے ایماء سے قائم ہوئی ہے۔ مولانا آزاد سبحانی جمعیۃ العلمائے اسلام کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم دلبر حسن صاحب کے یہاں قیام کیا، جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب اسی قیام کے دوران میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدیدار سے ملے، جن کا نام بھی قدرے شبہ کے ساتھ بتلایا گیا اور مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیۃ العلمائے ہند کے اقتدار کو توڑنے کے لیے ایک
> علماء کی جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد طے ہوا

کہ گورنمنٹ ان کو کافی امداد اس مقصد کے لیے دے گی۔
چنانچہ ایک بیش قرار رقم اس کے لیے منظور کر لی گئی اور اس کی
ایک قسط مولانا آزاد سبحانی صاحب کے حوالہ بھی کر دی گئی۔
اِس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ
الرحمٰن صاحب نے کہا کہ یہ اِس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر
آپ اطمینان فرمانا چاہیں تو ہم اطمینان کرا سکتے ہیں۔ "

(طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۱۔۱۳)

مولوی حفظ الرحمان سیو ہاروی کی اس تقریر کے جواب میں مولوی شبیر احمد عثمانی کا بیان بھی قابل غور وفکر ہے

"پہلے میں (شبیر احمد عثمانی) اُس معاملہ کی نسبت گفتگو شروع
کرتا ہوں، جو آپ نے مولانا آزاد سبحانی کے متعلق بیان
فرمایا ہے۔ جو روایت آپ نے بیان کی، میں نہ اس کی
تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے
ہوں مجھے اس سے پہلے ہی بذریعہ ایک گمنام خط کے (جو
دہلی سے ڈالا گیا تھا) یہی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اس خط
میں دھمکی دی گئی تھی۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط، بہرحال
میرے علم میں آچکی ہے۔ لیکن اس روایت سے مجھ پر کیا اثر
پڑ سکتا ہے اور میری رائے کیا متاثر ہو سکتی ہے؟

میں نے جو رائے پاکستان وغیرہ کے متعلق قائم کی ہے، وہ
بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ جمعیۃ العلمائے اسلام میں آزاد
سبحانی رہیں یا نہ رہیں، جمعیۃ العلمائے اسلام خود قائم رہے
یا نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں
کے لیے پاکستان مفید ہے۔
اگر میں تھوڑی دیر کے لیے اِس روایت کو تسلیم بھی کرلوں کہ
جمعیۃ العلمائے اسلام گورنمنٹ کے ایماء سے قائم ہوئی
ہے، تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ کانگریس کی ابتدا کس نے
کی تھی اور کس طرح ہوئی تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ ابتداءً اسکا
قیام ایک وائسرائے کے اشارے پر ہوا تھا۔"
(طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۴، ۱۵)

حقیقت کا حال تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن اُن کے جواب کی روشنی میں اگر موصوف کو انگریز دوستی سے برأت کا سرٹیفکیٹ نہ بھی مل سکے، لیکن برٹش گورنمنٹ کا آلۂ کار ثابت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ رہا مولوی آزاد سبحانی رُکنِ جمعیۃ العلمائے اسلام کا معاملہ تو فریقین (عمائد وعلمائے دیوبند) کے بیانات کی روشنی میں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ موصوف کی انگریز دوستی بلکہ ایجنٹی وآلہ کاری شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

۲۰۔ مولوی محمد الیاس کاندھلوی

موصوف ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کی خدمت میں تحصیل علم وفیض کے لیے حاضر ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور اُن کی وفات تک اپنے پیر گنگوہی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے، اُس وقت آپ عمر کی بیس منزلیں طے کر چکے تھے۔ دیو بندی حضرات کی تبلیغی جماعتیں جو آجکل بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، اِس تحریک کے بانی یہی مولوی محمد الیاس صاحب ہیں۔ یہ تبلیغی نظام کب اور کیوں قائم ہوا، اس کا تاریخی تذکرہ باب دوم میں اپنی جگہ پر ہو چکا ہے۔ علمائے دیو بند کی جس میٹنگ کا گزشتہ سطور میں تین دفعہ ذکر آچکا ہے، اُسی میں مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے یہ بھی کہا تھا:

> "اسی ضمن میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداءً حکومت کی طرف سے بذریعہ حاجی رشید احمد صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا پھر بند ہو گیا۔"

(طاہر احمد قاسمی، مولوی: مکالمۃ الصدرین، مطبوعہ لاہور، ص ۱۳)

حکومت نے امداد دینے کا وعدہ کر کے شردھانند کے مقابلے پر تبلیغ شروع کروا تو دی لیکن جیسا کہ مذکور ہوا، کچھ عرصہ گزرنے پر وظیفہ دینا بند کر دیا۔ کاندھلوی صاحب

(المتوفی ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء) اس وقت شاید یہ شعر پڑھا کرتے ہوں گے:

؎ صبر اُس پر اس ہماری حسرتِ دیدار کا
بند جس نے کر دیا روزن تری دیوار کا

۲۱۔ مرزا غلام احمد قادیانی

دورِ حاضر کا مسیلمہ، اُمت کے تیس (۳۰) دجالوں میں سے ایک دجال، مرزا غلام احمد قادیانی بھی ہے۔ موصوف نے مجدد اور مصلح کے دعاوی سے سلسلہ شروع کیا۔ دعویٔ نبوت کرنا تو عام مشہور ہے لیکن اِس خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو فراموش کر دینے والے اس شخص نے اپنے متعلق خدا ہونے تک کے متعدد دعاوی کیے ہوئے ہیں۔ موت سے پیشتر اپنے کئی مخالفوں کو چیلنج کیا تھا کہ فریقین سے جو جھوٹا اور کذاب ہے اُسے خدائے بزرگ و برتر دوسرے کی زندگی میں ہیضہ یا طاعون وغیرہ متعدی مرض کے ساتھ ذلیل کر کے مارے۔ مخالفین تو سارے ہی زندہ رہے لیکن اُن کی زندگی میں مرزا صاحب ہی بعارضۂ ہیضہ ۲۶۔ مئی ۱۹۰۸ء بروز منگل ساڑھے دس بجے دن کے راہی ملکِ عدم ہوگئے اور اپنے جھوٹا ہونے کا سب کے سامنے بیّن ثبوت پیش کر گئے۔ برٹش گورنمنٹ کے آلۂ کاروں میں مرزا غلام احمد قادیانی کا مدِّ مقابل سر زمینِ پاک و ہند میں تو کوئی نہیں ہوا۔ مرزا غلام احمد کو یہ صفت ورثے میں ملی تھی۔ چنانچہ اپنے والد کے بارے میں خود یوں تصریح کی ہے:

"میرے والد مرحوم کی سوانح میں سے وہ خدمات کسی طرح

الگ ہو نہیں سکتیں جو وہ خلوصِ دل سے اس گورنمنٹ کی خیر
خواہی میں بجالائے۔ انھوں نے اپنی حیثیت اور مقدرت
کے موافق ہمیشہ گورنمنٹ کی خدمت گزاری میں اُس کی
مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے وقت وہ صدق اور وفاداری
دکھلائی کہ جب تک انسان سچے دل اور تہِ دل سے کسی کا خیر
خواہ نہ ہو ہرگز دکھلا نہیں سکتا۔"

(شہادت القرآن، ص۸۴)

اپنے والد کے بارے میں دوسری کتاب کے اندر یوں لکھا ہے

"والد صاحب مرحوم اس ملک کے ممیز زمینداروں میں شمار
کیے جاتے تھے۔ گورنری دربار میں اُن کو کُرسی ملتی تھی اور
گورنمنٹ برطانیہ کے سچے شکر گزار اور خیر خواہ تھے"۔

(غلام احمد قادیانی، مرزا: ازالۂ اوہام، ص۵۰)

اُن کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے فخریہ انداز میں ایک جگہ یوں بھی
رقمطراز ہیں:

"سن ستاون (یعنی ۱۸۵۷ء) کے مفسدہ میں جبکہ بے تمیز
لوگوں نے اپنی محسن گورنمنٹ کا مقابلہ کر کے ملک میں شور
ڈال دیا، تب میرے والد بزرگوار نے پچاس گھوڑے اپنی
گرہ سے خرید کر کے اور پچاس سوار بہم پہنچا کر گورنمنٹ کی

خدمت میں پیش کیے اور پھر ایک دفعہ سو سوار سے خدمت
گزاری کی اور انہی مخلصانہ خدمات کی وجہ سے وہ اِس
گورنمنٹ میں ہر دلعزیز ہوگئے۔ چنانچہ جناب گورنر جنرل
کے دربار میں عزت کے ساتھ اُن کو کُرسی ملتی تھی اور ہر ایک
درجہ کے حکام انگریزی بڑی عزت اور دلجوئی سے پیش آتے
تھے۔"

(غلام احمد قادیانی، مرزا: شہادت القرآن، ص ۸۴)

اپنے بڑے بھائی، مرزا غلام قادر کی انگریز دوستی کے بارے میں موصوف نے یوں تصریح کی ہے:

"اِس عاجز کا بڑا بھائی، مرزا غلام قادر، جس قدر مدت تک
زندہ رہا، اُس نے بھی اپنے والد مرحوم کے قدم پر قدم مارا
اور گورنمنٹ کی مخلصانہ خدمت میں بہ دل و جان مصروف
رہا۔" (ایضاً: ص ۸۴)

خود مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) جہاد کے سخت مخالف اور برٹش گورنمنٹ کے نمبر ایک آلۂ کار تھے۔ اِس امر کا اعتراف موصوف نے اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

"میں ابتدائی عمر سے اِس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر
تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول

ہوں تا کہ مسلمانوں کے دِلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی
محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور اُن کے
بعض کم فہموں کے دِلوں سے غلط خیال، جہاد وغیرہ کے دُور
کروں جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔"

(غلام احمد قادیانی مرزا: تبلیغ رسالت، جلد ۷، ص ۱۰)

دوسری جگہ انگریزوں کی حمایت میں جہاد کی مخالفت کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

"میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت
(برٹش گورنمنٹ) کے سچے خیر خواہ ہوجائیں اور مہدی
خونی (امام مہدی علیہ السلام) اور مسیح خونی (حضرت عیسیٰ
علیہ السلام) کی بے اصل روایتیں (جو صحیح احادیث سے
ثابت ہیں) اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل (جو حکم
خدا اور عمل وارشادِ مصطفیٰ ہے) جو احمقوں کے دلوں کو خراب
کرتے ہیں، اُن کے دلوں سے معدوم ہوجائیں۔"

(غلام احمد قادیانی، مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۵)

موصوف نے انگریزی حکومت کے استحکام کی خاطر اُس کی حمایت میں جہاد کے خلاف بے شمار کتابیں لکھیں اور اشتہار شائع کرائے اور اپنے اِس اسلام دشمنی کے کارنامے پر آپ یوں فخر کیا کرتے ہیں:

"میں ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں

اِس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں۔"

(غلام احمد قادیانی، مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۵)

شاید پنجاب کے مشہور شاعر ظفر علی خاں نے یہ شعر اسی لیے کہا تھا:

طوقِ استعمارِ مغرب خود کیا زیبِ گلو
اور گواہ اِس پر ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

انگریزی حکومت کی اطاعت وفرماں برداری کی ترغیب دینے اور مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو برٹش گورنمنٹ کے مفاد کی خاطر ٹھنڈا کرنے کی غرض سے مرزا غلام احمد قادیانی نے تحریری طور پر جو کچھ کیا، اُس کی تفصیل یوں بیان کی:

"مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اِس ملک اور نیز دوسرے بلادِ اسلام میں اِس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے، لہٰذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعا گو رہے اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام کے تمام

ملکوں میں پھیلا دیں اور یہاں تک کہ اسلام کے دو (۲)
مقدس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور
روم کے پایہء تخت قسطنطنیہ اور بلادِ شام اور مصر اور کابل اور
افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا اشاعت
کردی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے
وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان
کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں
آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام
مسلمانوں میں سے اِس کی نظیر کوئی مسلمان دِکھلا نہیں سکا۔"

(غلام احمد قادیانی مرزا: ستارۂ قیصرہ، ص ۷)

جس طرح اپنے دور میں جعفر بنگال اور صادقِ دکن ممتاز تھے اور اپنے سیاہ کارناموں کو سرمایۂ افتخار سمجھا کرتے تھے اُس طرح اپنے پیش رو حضرات سے مرزا صاحب ملّت فروشی یا دین فروشی میں کم تھوڑے ہی رہ گئے تھے جو یہ فخر نہ کرتے بلکہ معلوم تو یوں ہوتا ہے کہ موصوف اپنے میدان کے سارے کھلاڑیوں کو مات دے کر، سب سے ممتاز ہو گئے تھے۔ اِسی اسلام دشمنی اور ملّت فروشی کے باعث انھیں خود احساس تھا کہ کسی بھی اسلامی ملک میں، کوئی مسلمان حکمران، اِن کے وجود کو برداشت نہ کر سکے گا اور برٹش گورنمنٹ کے ماتحت اور اس کی سرپرستی میں جو یہ عظیم فتنہ پرورش پا رہا ہے، اسلامی حکومت اسے جڑ سے اکھاڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اِس حقیقت کا سر سید احمد خاں علی

گڑھی اور مولوی محمد حسین بٹالوی کی طرح خود مرزا صاحب نے علی الاعلان اور بغیر کسی ہیر پھیر کے یوں اعتراف کیا ہے:

" خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اِس سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کو بنادیا ہے۔ یہ امن جو اِس سلطنت کے زیرِ سایہ ہمیں حاصل ہے، نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے اور نہ مدینہ میں اور نہ سلطانِ روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں۔"

(غلام احمد قادیانی مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۶)

دوسری جگہ موصوف نے اور وضاحت سے اِسی امر کا واشگاف اعتراف یوں کیا ہے:

" اگرچہ اِس محسن گورنمنٹ کا ہر ایک پر رعایا میں سے شکر واجب ہے، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ پر سب سے زیادہ واجب ہے، کیونکہ یہ میرے اعلیٰ مقاصد جو جنابِ قیصرۂ ہند کی حکومت کے سایہ کے نیچے انجام پذیر ہو رہے ہیں، ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ کسی اور گورنمنٹ کے زیرِ سایہ انجام پذیر ہو سکتے، اگرچہ وہ اسلامی گورنمنٹ ہی ہوتی۔"

(غلام احمد قادیانی مرزا: تحفہ قیصریہ، ص ۲۷)

مرزا صاحب اِس امر کے بھی معترف ہیں کہ اُنھیں ملکہ وکٹوریہ کے حکم سے نبی بنایا گیا تھا۔ نبی بنانے والے گورنر جنرل یا وائسرائے کا نام چونکہ انھوں نے تحریر نہیں کیا، لہٰذا

اِس کے ذکر کو چھوڑ کر ملکہ برطانیہ کے متعلق بیان ملاحظہ ہو:

"اے بابرکت قیصرۂ ہند! تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی نگاہیں اس ملک پر ہیں۔ خدا کی رحمت کا سایہ اس رعایا پر ہے جس پر تیرا ہاتھ ہے۔ تیری ہی پاک نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔"

(غلام احمد قادیانی مرزا: ستارۂ قیصرہ، ص ۱۵)

مرزا غلام احمد قادیانی کو ملکہ وکٹوریہ کے جس ماتحت حاکم نے نبی بنایا تھا، اِس سے اُس کا مقصود کیا تھا اور مرزا صاحب کو کس ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا؟ موصوف نے اِس سوال کا جواب خود یوں دیا ہے:

"اُس نے اپنے قدیم وعدہ کے موافق، جو مسیح موعود کے آنے کی نسبت تھا، آسمان سے مجھے بھیجا، تاکہ میں اُس مردِ خدا کے رنگ میں ہو کر جو بیت اللحم میں پیدا ہوا اور ناصرہ میں پرورش پائی، حضور ملکۂ معظّمہ کے نیک اور بابرکت مقاصد کی اعانت میں مشغول رہوں۔"

(ایضاً ص ۱۰)

موصوف کو اعتراف تھا کہ وہ انگریزی حکومت کا خود کاشتہ پودا ہیں، اسی لیے اپنے نبی بنانے والوں کی خدمت میں اپنی خدمات یاد دلا کر، یوں دست بستہ عرض پرداز ہوئے تھے:

"التماس ہے کہ سرکار دولت مدار، ایسے خاندان کی نسبت، جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار، جانثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کا خیر خواہ اور خدمت گزار ہے۔ اِس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط سے اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت و مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔"

(غلام احمد قادیانی مرزا: تبلیغ رسالت، جلد ۷، ص ۱۹)

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

"التماس ہے کہ سرکار دولت مدار، ایسے خاندان کی نسبت، جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار، جانثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کا خیر خواہ اور خدمت گزار ہے۔ اِس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم واحتیاط سے اور تحقیق وتوجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت ومہربانی کی نظر سے دیکھیں۔"

(غلام احمد قادیانی مرزا: تبلیغ رسالت، جلد ۷، ص ۱۹)

؎ اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیّاد کے اقبال کا

شیعہ حضرات

متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں بسنے والے مسلمانوں کا مذہب، اہلسنت و جماعت تھا، جن کو آجکل بریلوی مکتبِ فکر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ہے اور جملہ جماعتیں جو آج کل نظر آرہی ہیں وہ انگریزی دورِ حکومت میں اسی جماعت سے، برٹش گورنمنٹ کے تخریبی منصوبے کے تحت، جدا ہو کر بنی تھیں، ماسوائے شیعہ حضرات کے جو سرزمینِ پاک و ہند میں مغلوں کے دور سے موجود تو تھے لیکن انتہائی اقلیت میں، یعنی آٹے میں نمک کے برابر۔ اِن حضرات نے اپنے لیے یہی بہتر سمجھا کہ برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ بن کر رہیں، اِسی لیے انگریزوں کے خلاف انھوں نے کبھی کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ شیعہ صاحبان کی اِس وفاداری کا ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے یُوں اعتراف کیا ہے:

> "بغاوت کے غیر ضروری ہونے پر اِن کا اعلان بغیر کسی دباؤ کے واقع ہوا اور یہ بات نہایت ہی خوب ہے کہ ایسا اعلان باضابطہ طور پر تحریر میں آگیا۔ اِس دستاویز پر مستند اور قابلِ اعتماد شیعہ علماء کی مُہریں ثبت ہیں اور یہ پورا فرقہ اس پر ہمیشہ عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اِس قسم کے باقاعدہ وعدوں کے بغیر بھی وہ قدرتاً وفادار ہیں۔"

(ولیم ہنٹر ڈاکٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۱۰۹)

ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے بیان کے متعلق سر سید احمد خاں صاحب کے اپنے تاثرات یہ ہیں:

> "اِس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شیعہ لوگوں کا کچھ ذکر لکھا ہے اور جو تعریف ان لوگوں کی کی ہے گو وہ بھی مشروط بہ شرائط ہیں، لیکن میں اس طرح سے بھی خوش ہوں، کیونکہ میری دانست میں یہی غنیمت ہے کہ اس عالِم ڈاکٹر نے مسلمانوں کے ایک فرقہ کی تو تعریف کی۔ چنانچہ میں ان کی اِس قدر مہربانی اور رحم کا شکر گزار ہوں۔"

(سر سید احمد خاں: ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ص ۸۷)

قارئین کرام! جن حضرات کو برٹش گورنمنٹ نے سرزمینِ پاک و ہند سے اپنا آلۂ کار بنا کر، ان سے تخریبِ دین کا کام لیا، اُن سے مسلمانوں کی ملی وحدت کو پارہ پارہ کروایا، ایک اسلام کے متعدد جعلی اسلام بنوائے اور اس طرح یہاں کے مسلمانوں کو ایک پریشان کن مصیبت میں مبتلا کر کے ان کی طاقت کو منتشر اور دین و ایمان کو تباہ و برباد کروایا، ایسی سیکڑوں ہستیوں میں سے چند نامور حضرات کی اِس باب میں نشان دہی کی گئی ہے اور ان کے بارے میں جو بیانات پیش کیے ہیں، وہاں بھی مقصود ایسے جملہ بیانات کا حصر ہرگز نہیں تھا، بلکہ نمونے کے طور پر چند واضح اور غیر مبہم عبارتیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے کیونکہ پرکھنے والے تو ان کی روشنی میں بھی کھرے اور کھوٹے سکوں کی پہچان سکیں گے پھر طوالت کی کیا ضرورت؟

غیر مسلموں سے دوستی کا شرعی حکم کیا ہے؟ اِس بارے میں آگے مستقل عنوان کے تحت

بقدر کفایت جواب موجود ہے۔ لیکن یہ تو نرالا ہی ستم ہے کہ یہاں معاملہ دوستی پر بھی ختم نہ ہوا بلکہ ایجنٹ اور آلۂ کار تک بن گئے۔ اگر کلامِ الٰہی کو سامنے رکھتے، اُس پر یقین ہوتا، اپنے پیدا کرنے والے کی بات سُنتے تو ہرگز بھی اُن دشمنانِ دین کے پھندے میں نہ پھنستے جبکہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں بھی کلامِ الٰہی یوں خبردار کر رہا تھا:

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ
یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ

وہ جو کافر ہیں، کتابی یا مشرک، وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی
اترے تمہارے رب کے پاس سے (البقرۃ: آیت ۱۰۵)

کیا اُن حضرات نے اس حقیقت کو مدِ نظر رکھا؟ باری تعالیٰ شانہٗ فرمائے کہ اہلِ کتاب کبھی تمہاری بھلائی نہیں چاہتے، لیکن ان حضرات نے باری تعالیٰ شانہٗ کی نعمتوں کے خزانوں کی کنجیاں ہی شاید برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں میں سمجھ رکھی تھیں کہ خدا سے منہ موڑ لیا اور حکومت سے رشتہ جوڑ لیا۔ کاش! وہ قرآنِ کریم سے یہ پوچھ لیتے کہ اہلِ کتاب بھی اگر ہماری بھلائی میں خوش نہیں تو اور کس بات میں خوش ہیں؟ اگر وہ اتنا پوچھنے کی زحمت برداشت کرتے تو اللہ تعالیٰ کا کلام معجز نظام انھیں واضح طور پر یہ بتاتا کہ:

وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِّنْ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ
کُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْحَقُّ

بہت کتابیوں نے چاہا، کاش! تمھیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر

دیں، اپنے دلوں کی جلن سے، بعد اِس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے۔ (البقرہ آیت ۱۰۹)

مسلمانو! کلامِ الٰہی کی سنو کہ اکثر اہلِ کتاب کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جلن اٹھتی رہتی ہے اور اسے بجھانے کی خاطر وہ یہی حربہ استعمال کرتے ہیں کہ مسلمان سے کافر بنا دیں۔ جائے غور ہے کہ جو حضرات اُن حاسدوں کی جھولی میں جا گرے تھے کیا انگریزی ڈھنڈورچیوں کے مطابق واقعی امیر المومنین، مصلح، ریفارمر، نبی اور شمس العلماء بنایا تھا؟ قرآن کو سچا جانو کہ جہاں ان کا بس چلے وہ مسلمان کو کفر کی طرف پھیرتے ہیں۔ اگر خدا نہ کرے اب بھی کوئی شک باقی رہ گیا ہے اور ارشادِ ربانی اور سن لو کہ اہلِ کتاب کسی مسلمان سے کس صورت میں اور کب راضی ہو سکتے ہیں؟ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں کلام الٰہی کی ایک روشن آیت کا حصّہ ہے:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ

اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو۔ (البقرۃ، آیت ۱۲۰)

اب تو واضح ہو گیا کہ مسلمان کو مسلمان ہی دیکھتے ہوئے یہود اور نصاریٰ کبھی راضی نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر خوش ہوں گے تو اسلام سے ہٹا کر اور اپنی ملت کا تابع بنا کر خوش ہوں گے سوچیے ذرا، جن حضرات نے برٹش گورنمنٹ کو راضی کرنا ہی اپنی زندگیوں کا مقصد اور اپنا اولین نصب العین بنا رکھا تھا، قرآنِ کریم کے آئینے میں دیکھیے کہ انگریزوں نے انھیں کیا بنایا ہوگا اور ان سے کب جا کر راضی ہوئے ہوں گے؟ اور دیکھیے کلامِ الٰہی

یوں بھی خبردار کررہا تھا:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تُطِيْعُوْ فَرِيْقاً مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ○

اے ایمان والو! اگر تم کچھ کتابیوں کے کہے پر چلے تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمھیں کافر کر چھوڑیں گے۔ (آلِ عمران، آیت ۱۰۰)

یہاں بھی صاف لفظوں میں بتادیا ہے کہ اہلِ کتاب تمہیں مصلح یا ریفارمر وغیرہ کچھ بھی نہیں بنائیں گے اگرچہ دھوکے میں رکھنے کے لیے لیبل تمھاری پیشانیوں پر ایسے ہی لگائیں گے، ورنہ حقیقت میں وہ تمھیں مسلمان نما کافر بنائیں گے۔ مصلح وغیرہ تو جب بنائیں کہ انھیں اسلام کی خیر خواہی منظور ہو، ابھی ارشادِ ربانی سُنا کہ اُن کے دلوں میں تو اسلام اور مسلمانوں کیخلاف حسد کی آگ بھڑکتی رہتی ہے اور یہ بھی بتادیا کہ اس آگ کو اِسی طرح بجھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں کہ اسلام سے پھر جائیں یا ان کی ملت کا ایک جُز بن جائیں، اَللّٰهُمَّ احْفِظْنَا مِنْهُمْ۔

قارئین کرام! آپ نے انگریز دوستوں کے اپنے یا ان کے متعلق ایک دوسرے کے بیانات ملاحظہ فرمائے اور اب آخر میں ارشادتِ خداوندی سُنے۔ اِن کی روشنی میں مذکورہ حضرات دین کے خیر خواہ تھے یا بدخواہ، خدا ترس تھے یا خوفِ خدا سے عاری، ملت کے غمخوار تھے یا زر پرست، مصلح اور ریفارمر تھے یا افتراق بین المسلمین کے ٹھیکدار؟ اِس امر کا فیصلہ کرنا اور اُس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا یہ آپ حضرات کی ذمہ داری ہے۔

مذکورہ صورتِ حال کے برعکس، راقم الحروف کو تو علی الاعلان یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کی حقیقی اور قدیمی جماعت، سوادِ اعظم اہلسنت و جماعت کے کسی ذمہ دار عالِم کے متعلق اس قسم کا ایک بیان بھی نہیں دکھایا جاسکتا کہ انھوں نے برٹش گورنمنٹ کی حمایت کی ہو، یا انگریزوں کے اشارے پر یا کسی بھی وجہ سے اسلامی عقائد ونظریات میں، اپنی طرف سے معمولی ردّ وبدل بھی کی ہو۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ۔احقر یہ بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہے کہ ہماری جماعت (جسے مبتدعین نے بریلوی فرقہ کہنا شروع کیا ہوا ہے) وہی چودہ سو سال سے چلی آنے والی قدیمی جماعت ہے اور ہمارے عقائد ونظریات وہی ہیں جو شروع سے لے کر اب تک متوارث چلے آرہے ہیں۔ باری تعالیٰ شانہٗ ہمیں اسی جماعت میں رکھے، جملہ مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو۔ اٰمین یا اللہ العٰلمین بحق سید المرسلین ربّنا لا تزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ . انک انت الوھاب ٥ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہٖ محمد و علیٰ الہٖ و صحبہٖ اجمعین.